ISSN 0970-180X

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ایک شخص نے کہا کہ شام ہو گئی
دوسرا شخص بولا
یوں کہو کہ صبح ہونے والی ہے

شمارہ ۱۳۱
اکتوبر ۱۹۸۷

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اول	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمت قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۱ — اکتوبر ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

صبر اور اعراض

مکہ کے زمانہ قیام میں صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم اسلام کے دشمنوں کے خلاف اقدام کریں۔ آپ نے فرمایا کہ صبر کرو۔ غزوۂ احزاب میں آپ نے خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان آڑ قائم کر دی تاکہ دونوں فریقوں میں جنگ نہ ہونے پائے۔ مکہ کے سفر میں بعض مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور کہا تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے ہو۔

اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ عمل کسی اندھا دھند کارروائی کا نام نہیں۔ عمل کا تعلق تمام تر حالات سے ہے۔ حالات کے مطابق کبھی ایک چیز مفید ہوتی ہے اور کبھی وہی چیز غیر مفید بن جاتی ہے اس دنیا میں کبھی ضروری ہوتا ہے کہ آدمی بولے اور کبھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ چپ ہو جائے۔ کبھی یہ مطلوب ہوتا ہے کہ آدمی مقابلہ کرے اور کبھی یہ مطلوب ہو جاتا ہے کہ آدمی مقابلہ کے میدان سے اپنے آپ کو ہٹا دے۔

موجودہ حالات مسلمانوں کے لیے حد درجہ نازک حالات ہیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے جہاد کا وقت نہیں بلکہ صبر کا وقت ہے۔ آج انھیں مقابلہ نہیں کرنا ہے بلکہ اعراض کرنا ہے۔ اس صبر اور اعراض کا مطلب بزدلی نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وقفۂ تعمیر حاصل کیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس ظلم اور تعصب کا کیس نہیں۔ وہ ایسے لوگوں کا کیس ہے جو زندگی کی دوڑ میں دوسرے لوگوں سے پچھڑ گئے ہوں۔ مسلمان آج جو کچھ بھگت رہے ہیں وہ خود اپنے پچھڑے پن کی قیمت ہے۔ اب ہمیں ایک وقفۂ تعمیر درکار ہے تاکہ ہم اپنے پچھڑے پن کی تلافی کر سکیں۔ اس وقفۂ تعمیر کو حاصل کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ صبر کا رویہ اختیار کیا جائے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ہر شکایت کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ مواقع کو استعمال کرنے کی خاطر مسائل کو نظر انداز کیا جائے۔

یہی زندگی کا راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستے ہیں وہ مسلمانوں کو تباہی کے سوا کسی اور منزل پر نہیں پہنچا سکتے۔

پیغام رسانی

سادہ طور پر ایک انسان کی آواز صرف اس کے قریبی لوگوں تک سنائی دیتی ہے۔ تاہم قدیم ترین زمانہ سے انسانی آواز کی توسیع کے مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ ابتداء اسلام میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔

اس کا ابتدائی طریقہ زیادہ زور کے ساتھ اپنی آواز نکالنا ہے۔ سورہ برارت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مکہ بھیجا کہ وہ حج کے موقع پر اس کا اعلان کر دیں۔ وہ مجمع کے درمیان بلند آواز سے پکارتے تھے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہیں کرے گا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں پکارتا پھرتا تھا، یہاں تک کہ میری آواز بیٹھ گئی (قال فکنت انادی حتی صحل صوتی، تفسیر ابن کثیر)

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ متکلم خود معتدل آواز سے بولے اور دوسرے لوگ اس کو سن کر بلند آواز سے اس کو دہرائیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے الفاظ رک رک کر ادا فرماتے تھے اور دوسرے افراد اس کو لے کر بلند آواز سے لوگوں کے سامنے دہراتے تھے (قال کان الرجل الذی یصرخ فی الناس بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو بعرفۃ ربیعۃ بن امیۃ بن خلف، سیرۃ ابن ہشام)

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ صاحب کلام خود سفر کر کے لوگوں کے پاس پہونچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی کے آخری دور میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ خود چل کر مختلف قبائل کی قیام گاہوں میں جاتے اور ان کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ سیرۃ ابن ہشام جلد دوم کے آغاز میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

چوتھا طریقہ جس کی مثال دور نبوت میں ملتی ہے وہ مکتوب کا طریقہ ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب امن قائم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف عرب کے رئیسوں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں درج ہے۔

موجودہ زمانہ میں انسانی آواز کی توسیع کے مشینی طریقے رائج ہو گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ کا طریقہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان عصری طریقوں کو بھی اسلام کی دعوت کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک موثر ترین انداز میں پہنچ سکے۔

اصل مسئلہ

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سیاست کو، ایک لفظ میں، احتجاج یا پروٹسٹ کی سیاست کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر ہندو قوم یا "ہندو حکومت" کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف پرجوش تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرز عمل نے مسلمانوں کو ایک نئے قسم کا پروٹسٹنٹ فرقہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اگر ان حضرات سے کہیے کہ آپ اس احتجاجی سیاست میں کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں تو وہ جواب دیں گے کہ یہ ہمارا دستوری حق ہے۔ اس ملک میں باقاعدہ دستور کی حکومت ہے۔ اگر ہمارے دستوری حقوق ہم کو نہ دیے جائیں تو خود دستور ہی ہم کو یہ حق دیتا ہے کہ ہم پُرامن ذرائع کو کام میں لے کر اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔

یہ بات گریمر کے اعتبار سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ اس دنیا میں ہندستان کے تحریری دستور کے اوپر ایک اور غیر تحریری دستور ہے۔ یہ غیر تحریری دستور پہلے دستور سے زیادہ اہم ہے۔ یہ غیر تحریری دستور یہ ہے کہ ——— جب دستور اور حقیقتِ واقعہ کے درمیان ٹکراؤ ہو تو حقیقتِ واقعہ باقی رہے اور دستور کے الفاظ ہوا میں گم ہو کر رہ جائیں۔

یہاں میں اس کی ایک واضح مثال دیتا ہوں۔ ہندستان کا دستور جو ملکی قیادت کے اتفاق رائے کے ساتھ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو نافذ کیا گیا تھا۔ اس کی دفعہ ۳۴۳ میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ پندرہ سال کی مدت تک انگریزی زبان یونین کی سرکاری زبان رہے گی۔ اس کے بعد اس کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری رسم الخط میں ہو جائے گی:

> For a period of fifteen years the English language shall continue to be the official language of the Union. Thereafter the official language shall be Hindi in Devanagri script.

اس دستوری دفعہ کے مطابق ہندی زبان کو پندرہ سال کے اندر یونین کی سرکاری زبان بننا تھا۔ مگر دو سنگین حقیقتیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئیں۔ ایک یہ کہ ہندی زبان ابھی اتنی زیادہ

ترقی یافتہ نہیں کہ وہ کامیاب طور پر دور جدید کی ایک ریاست کی سرکاری زبان بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان کے تمام بڑے بڑے علم بردار اپنے بچوں کو ہندی اسکول کے بجائے انگلش اسکول میں پڑھانا پسند کرتے ہیں۔

دوسری بڑی وجہ وہ تھی جو جنوبی ہند کی طرف سے پیدا ہوئی۔ جنوبی ہند جو ہندستان کا نصف حصہ ہے، اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ہندی کو انڈین یونین کی سرکاری زبان بنایا گیا تو تمام مرکزی شعبوں میں شمالی ہند کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ پیچھے ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ جنوبی ہند میں اس کے خلاف شدید رد عمل ہوا۔ یہاں تک کہ نئی دہلی کے پالیسی ساز لیڈروں کو دستور کی اس دفعہ کو تاریخ کے سرد خانہ میں ڈال دینا پڑا۔

ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کو دستوری حقوق نہ ملنے کا مسئلہ کہنا اس کی سنگینی کو گھٹانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود مسلمانوں کے اپنے پچھڑے پن کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اس ملک میں دراصل اپنے پچھڑے پن کی قیمت ادا کر رہے ہیں اور اس کو غلط طور پر وہ دوسروں کے ظلم اور تعصب کے خانہ میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔

جو صورت حال حقیقت کے زور پر پیدا ہوئی ہو، اس کو آپ قانون کے زور پر ختم نہیں کر سکتے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی بے شعوری ہے۔ اسی بے شعوری کی وجہ سے وہ اب تک تعلیم کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ اسی بنا پر وہ اس راز کو نہیں جانتے کہ مواقع کو استعمال کرنے کے لیے مسائل کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ تقریریں کرنے اور بڑے بڑے الفاظ بولنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض لفظ بازی ہے نہ کہ کوئی واقعی کام۔

اسی شعوری پچھڑے پن کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر چیز میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ شعور آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ حالات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھے۔ وہ اپنے لیے صحیح منصوبہ بنائے۔ وہ لوگوں کی مخالفانہ کارروائیوں کی کاٹ کر سکے۔ وہ اپنے امکانات کو سمجھے اور ہوش مندی کے ساتھ ان کو استعمال کرے۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسروں کے ظلم اور تعصب کے باوجود اپنے لیے راہ نکالنی پڑتی ہے، مسلمان اس صلاحیت کو کھو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حالات کے خلاف صرف چیخ پکار کر رہے ہیں، وہ ابھی تک اپنے لیے کوئی راستہ دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

داخلی احتساب

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

(المائدہ ۷۹-۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی، داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے خارجی احتساب کو زندگی کی علامت سمجھ لیا ہے۔ مگر مذکورہ آیت اس کے برعکس یہ اعلان کر رہی ہے کہ داخلی احتساب مسلمانوں کی ایمانی زندگی کی علامت ہے۔ مسلم معاشرہ کے اندر برائی کو برداشت نہ کرنا اور آپس میں ایک دوسرے کو غلط کام سے روکنا اسلام اور ایمان کی لازمی شرط ہے۔ اہلِ ایمان کے معاشرے میں اگر یہ صفت باقی نہ رہے تو ایسے لوگ اللہ کی نظر میں لعنت زدہ قرار پائیں گے، جیسا کہ یہود کے ساتھ ہوا۔ دوسروں کے خلاف احتجاج اور احتساب کی کوئی بھی مقدار اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بنی اسرائیل (یہود) کی مذکورہ روش سے ڈرایا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی خدا کی نظر میں اسی طرح ملعون ہو جاؤ گے جس طرح یہود خدا کی نظر میں ملعون قرار پائے۔ یہاں ہم چند حدیثیں نقل کرتے ہیں:

عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الرجل من بني اسرائيل كان اذا رأى اخاه على الذنب نهاه عنه تعذيرا فاذا كان من الغد لم يمنعه ما رأى منه ان يكون اكيله وخليطه وشريكه فلما رأى الله ذالك منهم ضرب قلوب بعضهم على بعض ولعنهم على لسان نبيهم داؤد وعيسى ابن مريم ذالك بما عصوا وكانوا يعتدون ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم والذى نفسى بيده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر ولتأخذن على

يد المسيء ولتأطرنه على الحق أطرا او ليضربن الله قلوب بعضكم على بعض او ليلعنكم كما لعنهم۔

عن حذيفة بن اليمان ان النبي صلى الله عليه وسلم قال والذی نفسی بيده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر او ليوشكن الله ان يبعث عليكم عقابا من عنده ثم لتدعنه فلا يستجيب لكم۔

عن عدی بن عميرة رضی الله عنه قال سمعت النبی صلی الله عليه وسلم يقول ان الله لا يعذب العامة بعمل الخاصة حتی يروا المنكر بين ظهرانيهم وهم قادرون علی ان ينكروه فلا ينكرونه فاذا فعلوا ذالك عذب الله الخاصة والعامة۔ (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک آدمی جب اپنے بھائی کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا تو وہ پہلی بار اس کو منع کرتا۔ مگر جب اگلا دن آتا تو جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اُس کو اِس سے نہ روکتا کہ وہ اس کے ساتھ کھائے اور اس کے ساتھ اٹھے بیٹھے۔ پس جب اللہ نے ان کے اندر یہ بات دیکھی تو ان کے دلوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کردیا۔ اور اپنے پیغمبر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی، ایسا اس لیے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جانے والے لوگ تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم کو ضرور ایسا کرنا ہوگا کہ تم (اپنے لوگوں کو) اچھائی کا حکم دو اور ان کو برائی سے روکو اور غلط کار کا ہاتھ پکڑلو اور اس کو حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کردے گا یا تم پر لعنت کرے گا جس طرح اس نے یہود پر لعنت کی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ضرور (اپنے لوگوں کو) اچھائی کا حکم دوگے اور ضرور برائی سے روکوگے۔ ورنہ قریب ہے کہ اللہ تمہارے اوپر اپنے پاس سے عذاب بھیج دے۔ پھر تم اللہ کو پکارو مگر وہ تمہاری پکار کو نہ سنے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ بعض لوگوں کے عمل کی سزا عام لوگوں کو نہیں دیتا یہاں تک کہ ان کا یہ حال ہوجائے کہ وہ برائی کو اپنے (لوگوں کے) درمیان دیکھیں اور وہ اس کا انکار کرنے پر قادر ہوں پھر بھی وہ اس کا انکار نہ کریں۔ پس جب وہ ایسا کرتے ہیں تو

اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

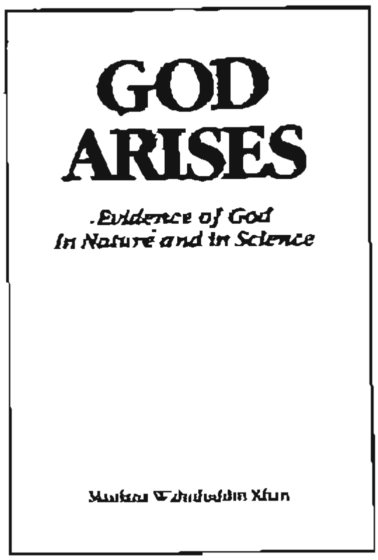
مذکورہ آیت اور مذکورہ احادیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے بارہ میں بھی خدا کا عین وہی قانون ہے جو اس سے پہلے یہود کے بارے میں تھا۔ اس اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو موجودہ فسادات وہی خدائی حکم نظر آنے لگتے ہیں جن کی پیشگی خبر حدیث میں دیدی گئی تھی۔ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے لعنت کی کوئی صورت نہ ہو۔ لعنت کے معنی ہیں خیر سے بعید کر دینا۔ موجودہ مسلمان شاید خدا کی رحمت سے دور کر دیئے گیے ہیں۔ وہ ہر صبح و شام اپنے "دشمنوں" کی بربادی کی دعائیں کرتے ہیں مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ان کے کچھ شرانگیز عناصر فساد کرتے ہیں اور اس کے بعد پوری قوم کو اس کی بدترین سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ تمام علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ موجودہ مسلمانوں پر شاید وہ کچھ نازل ہو چکا ہے جس کے نازل ہونے کا اندیشہ ان کے پیغمبر نے ظاہر کیا تھا۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بے قیدی اور بے راہ روی عام ہو گئی ہے۔ وہ بات بات پر لڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ چنانچہ تمام فرقہ وارانہ فسادات خود مسلمانوں کے بعض عناصر کی شرانگیز کارروائیوں سے شروع ہوتے ہیں۔ پھر جب فساد بڑھتا ہے تو پوری قوم کو اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ صورت حال بار بار پیش آرہی ہے اور تمام مسلمان اس کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں کوئی بھی قابل ذکر گروہ نہیں جو اپنے ان مجرموں کو کنڈم کرے اور ان کا ہاتھ پکڑنے کے لیے کھڑا ہو۔

مسلمانوں میں ایسے قائدین تو بہت ہیں جو حکومت (یا غیر مسلم فرقہ) کے خلاف تقریر اور بیانات کی دھوم مچانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ حتی کہ ان میں ایسے مجاہدین بھی ہیں جو زمانہ کی کلائی موڑنے اور ساری کائنات کا احتساب کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ مگر ان کے درمیان کوئی بھی ایسا قائد نہیں جو مسلمانوں کے اوپر محتسب بن کر کھڑا ہو۔ جو ان مسلمانوں کے خلاف دھوم مچائے جو برادران وطن کے ساتھ اشتعال انگیز کارروائیاں کرتے ہیں اور ان کی انا کو بھڑکا کر پوری قوم کو آگ اور خون میں نہلانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

مذکورہ احادیث کے مطابق ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں
کے اندر داخلی احتساب کا نظام قائم ہو۔ ہر جگہ کے مسلمان اپنے ان افراد کی نگرانی کریں جو ابتدائی
شرانگیزی کر کے فساد کی آگ بھڑکانے کا سبب بنتے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ قائدین اپنی ساری
طاقت حکومت (یا ہندو فرقہ) کے خلاف ایجی ٹیشن میں لگائے ہوئے ہیں۔ اس کے بجائے انھیں یہ
کرنا چاہیے کہ وہ اپنی ساری طاقت خود مسلم افراد کی روک تھام پر لگا دیں۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے
مسلمان اس کے سوا جو کچھ بھی کریں گے وہ صرف خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہوگا۔ وہ کسی درجہ
میں بھی مسئلہ کو حل کرنے والا نہیں بن سکتا۔



God Arises
by Maulana Wahiduddin Khan

This English edition of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, is an updated version, incorporating considerable additional material.

It has also been translated into a number of other languages, including Arabic, French, Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, Tamil, etc., and has come to be accepted as standard work on the Islamic position vis-a-vis modern thought.

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 Price Rs. 45
81-85063-17-6

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110 013

تہذیب جدید کے مسائل

"مغربی سماج میں اگر بگاڑ ہے تو مسلمانوں کے موجودہ سماج میں بھی بگاڑ ہے۔ اس کے باوجود آپ مغربی تہذیب کو غلط اور اسلام کو صحیح کیسے کہتے ہیں" ایک شخص نے کہا۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں۔ اس لیے کہ جس اعتبار سے ہم مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان تقابل کر رہے ہیں اس میں دونوں کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔ مسلم سماج کا بگاڑ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ عین اس کے اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ۔

مسلمانوں کے درمیان جو بگاڑ ہے وہ اصول اور عمل کے درمیان فرق ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ اصول اور حقیقتِ واقعہ کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے معاشرتی زندگی کے بارے میں مذہبی اصولوں کے بالمقابل کچھ دوسرے اصول وضع کیے۔ اور قدیم اصول کے مقابلہ میں جدید اصول کی معقولیت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ زمین کے قابلِ لحاظ حصہ پر مغربی اقوام کا سیاسی اور مادی غلبہ قائم ہو گیا۔ انھیں یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ وہ قدیم اصولِ حیات کو رد کر کے جدید اصولِ حیات کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کی تشکیل کریں۔

مغربی اقوام کے غلبہ کے ساتھ ہی یہ عمل شروع ہو گیا۔ اب اس تجربہ پر ۱۰۰ سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ مگر عملی تجربہ اصول کی صداقت کو ثابت نہ کر سکا۔ اس تجربہ نے صرف یہ بتایا کہ مغرب نے انسانی زندگی کے جو نئے اصول وضع کیے تھے وہ فطرت سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اصول اور حقیقتِ واقعہ کا یہ ٹکراؤ بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ مغربی زندگی میں شدید قسم کی ابتری پیدا ہو گئی جس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسلم سماج میں آج جو بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حل یہ ہے کہ مسلم سماج کو سابقہ اسلامی اصولوں کی طرف لوٹایا جائے۔ مگر یہی بات مغرب کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ مغرب کا سماج اگر پیچھے کی طرف لوٹایا جائے تو اس کا لوٹنا عین انھیں اصولوں کی طرف لوٹنا ہوگا جن پر آج بھی وہ پوری طرح قائم ہے۔ جن لوگوں نے آزادانہ جنسی اختلاط کا نظریہ پیش کیا یا جنھوں نے

عورت کو ہر مردانہ شعبہ میں داخل کرنے پر اصرار کیا یا جنھوں نے یہ کہا کہ نکاح کا ادارہ ایک غیر ضروری بندھن ہے۔ وہ آخر اپنے اصولوں کی طرف لوٹیں تو کس چیز کی طرف لوٹیں گے۔ وہ اسی چیز کی طرف لوٹیں گے جس پر آج بھی وہ قائم ہیں اور جس کے ہولناک نتائج سے وہ بالفعل دوچار ہو رہے ہیں۔

مسلمانوں کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اسلام کے چھوڑے ہوئے اصول کو دوبارہ اختیار کریں۔ جب کہ مغربی معاشرہ کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ اصول کو ترک کر دے۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے یہاں ہم کچھ واقعاتی مثالیں پیش کریں گے۔

اُلٹی طرف سفر

امریکہ کا انگریزی ہفتہ وار ٹائم (Time) نہایت کثیر الاشاعت میگزین ہے۔ وہ ۹۵ ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس میگزین نے اپنی اشاعت ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ میں امریکہ کے بارہ میں ایک دل چسپ رپورٹ شائع کی ہے۔ یہاں ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

پچھلے ۲۵ سال کے اندر امریکہ میں خاتون کارکنوں کی تعداد بہت بڑھی ہے۔ امریکہ میں اس وقت بچہ پیدا کرنے کی عمر کی خواتین کی ۶۵ فی صد تعداد دفتروں میں کام کرتی ہے۔ ان میں سے ۹۰ فی صد عورتیں وہ ہیں جو کارکردگی کے دوران حاملہ پائی گئی ہیں۔ عورتوں کے لیے یہ زبردست مسئلہ ہے ——— کام کا بھاری بوجھ اٹھانا اور اسی کے ساتھ بیک وقت بچوں کی ماں بننا :

the heavy burden of holding down a job
and having children at the same time.

اسی قسم کی ایک امریکی خاتون لیلین گارلینڈ (Lillian Garland) ہے۔ وہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی میں بطور ریسپشنسٹ کام کر رہی تھی۔ ملازمت کے دوران وہ حاملہ ہو گئی۔ چنانچہ اس نے ۱۹۸۲ میں عارضی طور پر دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ تین مہینہ تک دفتر نہ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر تین مہینہ کے بعد جب وہ دوبارہ دفتر آئی تو اس کو بتایا گیا کہ اب کمپنی میں اس کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس کی جگہ دوسرے کارکن کے ذریعہ پُر کر لی گئی تھی۔

گارلینڈ نے ۸۵۰ ڈالر ماہانہ کی سروس کھودی۔ وہ ایسے وقت میں بے روزگار ہوگئی جب کہ بچی کی پیدائش کے نتیجہ میں اس کے اخراجات کافی بڑھ چکے تھے۔ اس نے امریکہ کی فیڈرل کورٹ میں اپیل کی کہ کمپنی نے اس کو ملازمت سے برخواست کرکے اس کے ساتھ امتیاز (Discrimination) کا برتاؤ کیا ہے۔ مقدمہ چلتا رہا۔ گارلینڈ کے وکیل اور کمپنی کے وکیل نے ایک دوسرے کے خلاف دلائل پیش کیے۔ یہاں تک کہ پانچ سال بعد جنوری ۱۹۸۷ میں امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس تھر گڈ مارشل (Thurgood Marshall) نے فیصلہ دیا کہ خاتون کارکن اگر حاملہ ہوجائے تو جس ادارہ میں وہ کام کررہی ہے اس کو چاہیے کہ وہ اس کو چار مہینہ کی باضابطہ رخصت دے۔

اس فیصلہ نے امریکہ میں زبردست بحث چھیڑ دی ہے۔ ایک طرف آزادی نسواں کی حامی خواتین خوش ہیں کہ بچے کی پیدائش اور نگہداشت کے مسئلہ میں انھیں قانون کی حمایت حاصل ہوگئی۔ دوسری طرف امریکہ کے سنجیدہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ فیصلہ خواتین کے لیے مضر ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اس قسم کا تحفظ صرف خواتین کے حق میں امتیاز کو بڑھانے والا ثابت ہوتا ہے۔ یہ تدبیر ایسی ہے جو ہمیشہ الٹا نتیجہ ظاہر کرتی ہے:

That almost always backfires.

لاس اینجلس کی مرچنٹس اینڈ مینوفیکچررس ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر ڈون بٹلر (Don Butler) نے کہا کہ یہ فیصلہ ایک مہلک فیصلہ ہے۔ اگر کمپنیوں کو اس طرح حاملہ خواتین کو چار مہینہ کی باضابطہ رخصت دینی پڑی تو وہ دیوالیہ پن (Bankruptcy) کا شکار ہوجائیں گی۔ امریکی چیمبر آف کامرس کے اٹارنی لیمپ (Attorney Lamp) نے کہا کہ اس طرح عورت کے خلاف امتیاز اور بڑھ جائے گا۔ اس لیے کہ بہت سی کمپنیاں یہ نہ چاہیں گی کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی عمر میں عورتوں کو اپنے یہاں ملازم رکھیں:

Discrimination against women might increase. Many companies just won't hire women in their childbearing years (p. 21).

گارلینڈ کے مذکورہ معاملہ کی حمایت میں ایک مشہور خاتون لیڈر بیٹی فریڈان (Betty Friedan)

نے کہا کہ عورت اور مرد کے درمیان برابری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں مردوں کے نمونہ پر پوری اُتریں :

Equality does not mean women have to fit the male model.

یہ دلیل بھی کیسی عجیب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب عورتیں اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے اتنی مختلف ہیں کہ وہ مردوں کے "ماڈل" کے مطابق نہیں بن سکتیں تو اس عجیب وغریب صنفی برابری کی کیا ضرورت ہے کہ عورتوں کو مردوں کی طرح ہر جگہ کام کے لیے کھڑا کر دیا جائے۔ اور پھر جبری قوانین کے ذریعہ اس مصنوعی برابری کو قائم رکھا جائے۔

اسی طرح سلویا این ہیولٹ (Sylvia Ann Hewlett) نے کہا کہ امریکہ کی عدالت عالیہ کے اس فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ ترین قانونی سطح پر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا کہ عورتوں کو دفاتر میں برابری کا مقام دلانے کے لیے ایک خاندانی سپورٹر کو وجود میں لانا ہوگا :

This decision means that there is recognition at the highest legal levels that in order to get equal results for women in the workplace, you have to create family supporters (p. 21).

یہ قدیم روایتی نظام کی معقولیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔ جدید تہذیب نے یہ معیار پیش کیا تھا کہ مرد کو عورت کا سپورٹر نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ عورت خود کمائے اور خود اپنی سپورٹر بنے۔ مگر جب اس اصول کو عمل میں لایا گیا تو معلوم ہوا کہ عورت سپورٹر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے اس سپورٹر کا نام "شوہر" تھا اور اب اس سپورٹر کا نام "کمپنی" ہے۔

قدیم روایتی ماحول جو مذہب کے زیر اثر بنا تھا، اس میں مرد بنیادی طور پر باہر کا کام کرتے تھے اور عورتیں بنیادی طور پر گھر کا کام۔ یہ دراصل ایک طرح کی تقسیم کار تھی۔ مگر جدید تہذیب نے اس کے متعلق کہا کہ یہ ایک صنف اور دوسری صنف کے درمیان امتیاز ہے۔ چنانچہ زور وشور کے ساتھ آزادیٔ نسواں کی تحریک چلی۔ عورتوں کو گھروں سے نکال کر دفتروں اور کارخانوں میں ڈال دیا گیا۔

مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس نئے انتظام میں مختلف قسم کی رکاوٹیں حائل ہیں۔ مثال کے طور پر عورت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ حاملہ ہوتی ہے۔ وہ بچہ پیدا کرتی ہے اور پھر ایک مدت تک

وہ باہر کے کام کے قابل نہیں رہتی۔ اس مشکل کے حل کے لیے قانون بنایا گیا کہ عورت کو حمل اور رضاعت کے دوران خصوصی چھٹی دی جائے۔ مگر اس قسم کا لفظی کھیل صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو قانون ساز مجالس میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں۔ اس اصول کا تحمل وہ لوگ نہیں کر سکتے جن کو عملاً ایک کارخانہ چلانا ہے یا ایک دفتر کا انتظام کرنا ہے۔ چنانچہ اب مالکوں اور خاتون ملازموں کے درمیان لامتناہی جھگڑے چھڑ گیے ہیں۔

حکومتی ادارہ اب تک اس نزاع میں بظاہر خواتین کا ساتھ دے رہا ہے تاکہ اس کے تہذیبی اصول کی عظمت باقی رہے۔ مگر حقیقت کے خلاف یہ جانب داری قابل عمل نہیں۔ حکومت اگر دفتروں اور کارخانوں سے کہے کہ وہ خاتون کارکنوں کو "چار ماہ" کی باتنخواہ چھٹی دیں تو کون ادارہ اس تہذیبی تعیش کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اداروں میں یہ رجحان بڑھے گا کہ جوان عورتوں کو ملازمت میں نہ لیا جائے اور جب عورتیں بوڑھی ہو چکی ہوں گی تو وہ اپنے آپ ملازمتوں میں جانے سے رک جائیں گی۔ اس طرح مغربی سوسائٹی میں وہی چیز شدید تر صورت میں پیدا ہو جائے گی جس کو ختم کرنے کے لیے آزادی نسواں کی تحریک چلائی گئی تھی۔ یعنی صنفی امتیاز۔

مایوسی کا شکار

۱۲ - ۱۶ جنوری ۱۹۸۷ کو نئی دہلی (وگیان بھون) میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں پندرہ ملکوں کے فلسفی، سائنٹسٹ، مصنف اور آرٹسٹ شریک ہوئے۔ اس پانچ روزہ کانفرنس کا عنوان تھا: نئے آغاز کی طرف (Towards New Beginning) اس کانفرنس کا اہتمام مرکزی حکومت ہند نے کیا تھا۔

اس عالمی کانفرنس میں مغربی دنیا کی کئی ممتاز خواتین بھی شریک ہوئیں جو اب بڑھاپے کی عمر میں ہیں اور انھوں نے اپنی پوری زندگی آزادئ نسواں کی تحریک چلانے میں گزاری ہے۔ مگر اب وہ مایوسی کا شکار ہیں۔ آسٹریلیا کی جرمین گریر جو بین اقوامی شہرت کی مالک ہیں، ان کے بارہ میں انڈین اکسپریس (۱۴ جنوری ۱۹۸۷) کے نامہ نگار کے الفاظ یہ ہیں کہ آج کل وہ بہت دکھی نظر آتی ہیں۔ ان کا وہ جوش جو فیمیل یونک نامی کتاب لکھنے کے وقت ان کے اندر تھا وہ

Whither Women's Lib?

They are feminists of different hues — Ms. Germaine Greer, the outspoken, aggressive writer from Australia, and Ms Gisele Halimi, a Tunisian-born lawyer who spearheaded the women's movement in France along with Simone de Beauvoir and others. But both voice a concern that is troubling feminists in the West today — Whither women's lib? Ms Greer seems more mellow today, the fire that raged in 'The Female Eunuch' is strangely missing. 'The movement has solved some problems and left us with a different set of problems' exclaimed Ms Greer. Perhaps the problem was that we didn't take our mothers with us. We left them behind, found them antiquated. And now that many of us are mothers ourselves with teenaged daughters, perhaps we understand our mothers better. (*Indian Express,* January 14, 1987)

The West has no answers to the problems of inequality between sexes, says the internationally acclaimed writer Germaine Greer. The erroneous belief of the western women that the females in veils are unequal and the ones with make-up minus the head-cover are free and liberated has to be rejected. Referring to the prevalance of 'wife-beating' even in the so-called 'civilised' West, she asks, how about the unequal treatment meted out to females in the US and England in the areas of wages and jobs? Well, one-fourth of the crimes in England enamates from violence against women. The man-woman relationship understood in the West as an extension of role-models is the primary cause of strain in the sexual relationships. All the western women identify themselves with the 'bahu' —the bride — forgetting that the mother-in-law and the sister-in-law are also the specific role-models to be played by females. She feels that child for a woman is a unique investment. 'The joys of motherhood fill the blanks that cannot be satiated in the specific husband-wife role models.' Known for her non-conformist and non-traditional views, she advocates 'Coitus interrupts' in the area of birth-control. 'The array of occlusive devices, spermicidal creams, quinine pessaries, douches, syringes, abortifacient pills and rubber goods of all shapes and sizes are the ill-effects of a growing consumer-culture. These have achieved nothing but added strain in the sexual relationships.' (*The Hindustan Times,* January 12, 1987)

Ms Halimi, is more frank. 'It is a bad time for the women's movement,' she admitted. 'It is down at the moment and we are trying to find the reasons for it. Perhaps we got everything women wanted too fast — contraception, abortion, and divorce. And the problems that face women today are not strong enough to give the movement new force and strength.' Women have very specific values and morals. They have a different view of humanity. I am not saying that it is better than that of men but it is different. And women have to prove that they are women, and not men, she emphasised. (*Indian Express,* January 14, 1987).

حیرت انگیز طور پر غائب نظر آتا ہے۔ جرمین گریر نے مغرب کی آزادی نسواں کی تحریک پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے کچھ مسائل حل کیے ہیں اور ہم کو کچھ نئے قسم کے مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔

جرمین گریر اپنی جوانی کی عمر میں اتنی آزاد خیال تھیں کہ وہ نکاح کے طریقہ کو ختم کرنے کی وکیل بنی ہوئی تھیں۔ مگر اب وہ بدل چکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاید مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ماؤں کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ ہم نے انھیں پیچھے چھوڑ دیا اور ان کو قدامت پرست سمجھ لیا۔ اب جب کہ ہم میں سے اکثر ماں بن چکی ہیں۔ اور ہمارے ساتھ لڑکیاں ہیں تو اب ہم مسائل کو کسی قدر مختلف انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید اب ہم اپنی ماؤں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ مغرب کے پاس مرد اور عورت کے درمیان نابرابری کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔ مغربی عورت کا یہ خیال غلط ہے کہ پردہ دار عورتوں کو برابری حاصل نہیں ہے اور وہ عورتیں جو بناؤ سنگار کے ساتھ اور کھلے سر ہوتی ہیں وہ آزاد ہیں۔ اس فکر کو اب رد کر دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ نام نہاد مہذب مغرب میں بھی عورتوں کے مارنے کے واقعات موجود ہیں۔ مزید یہ کہ امریکہ اور انگلینڈ جیسے ملکوں میں بھی تنخواہ اور ملازمت کے معاملہ میں عورتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ انگلینڈ میں ہونے والے جرائم کی چوتھائی تعداد وہ ہے جو عورتوں کے خلاف تشدد سے متعلق ہے۔

فرانس کی مزلیمی اس معاملہ میں اور بھی زیادہ کھل کر بولتی ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ خواتین نے جو کچھ چاہا تھا وہ سب انھوں نے پالیا۔ مگر ان کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ انھوں نے کہا کہ عورتیں بہت مخصوص قسم کی اخلاقی اقدار رکھتی ہیں۔ انسانیت کے بارے میں وہ ایک مختلف نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کا نقطۂ نظر بہتر ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عورتوں کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے کو عورت ثابت کریں نہ کہ غیر حقیقی طور پر مرد بننے کی کوشش کریں۔

مذہب کی تعلیمات کے مطابق عورت کا "رول ماڈل" یہ تھا کہ وہ گھر کو سنبھالے اور بچوں کی تربیت کرے۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کا رول ماڈل یہ بنایا گیا کہ وہ باہر کی زندگی میں نکلیں اور ہر شعبہ میں بالکل مردوں کی طرح کام کریں۔ یہ دوسرا رول ماڈل تجربہ کے بعد قابل عمل ثابت نہ

ہو سکا۔ اپنے بڑھاپے کی عمر میں وہی مغربی خواتین پرانے رول ماڈل کی حمایت کر رہی ہیں جنھوں نے اپنی جوانی کی عمر میں نئے رول ماڈل کی پر جوش وکالت کی تھی۔

کیا اس کے بعد بھی مذہب کے بتائے ہوئے رول ماڈل کی معقولیت پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔

دردناک انجام

پلین ٹروتھ (The Plain Truth) ایک مشہور امریکی میگزین ہے۔ وہ ۸۵۰۰۰۰۰ کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ اس ماہنامہ کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۶ میں صفحہ اول پر ایک امریکی لڑکی کی تصویر ہے جو حیرانی کے عالم میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کا نام سالی (Sally) ہے۔ میگزین میں اس لڑکی کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا خط ہے۔ مگر وہ جتنا چھوٹا ہے اتنا ہی زیادہ وہ دردناک ہے۔ وہ مختصر خط یہ ہے:

> When I was 8 years old I first had sex with a boy of 15. I did it because I lack love and attention from my parents. I need love, and my parents never show me any. Nothing really changed at home, and at 15 I became pregnant. My boy friend blamed me and left. I had nowhere to turn, I was trapped, so I had an abortion. Now I'm afraid to date anyone, and I cry myself to sleep every night.

ترجمہ: جب میری عمر آٹھ سال تھی اس وقت میں نے پہلی بار ایک پندرہ سالہ لڑکے کے ساتھ جنسی فعل کیا۔ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میں اپنے والدین کی طرف سے محبت اور توجہ پانے سے محروم تھی۔ مجھے محبت کی ضرورت تھی، مگر مجھے کبھی اپنے والدین کی محبت نہ مل سکی۔ (میرے اس حال کے باوجود) گھر کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور میں پندرہ سال کی عمر میں حاملہ ہوگئی۔ میرے دوست لڑکے نے مجھ کو ملزم ٹھہرایا اور مجھ کو چھوڑ دیا۔ کوئی صورت میرے لیے باقی نہ رہی۔ میں پھنس کر رہ گئی۔ چنانچہ میں نے حمل ساقط کرالیا۔ اب میں کسی لڑکے سے تعلق قائم کرنے سے ڈرتی ہوں۔ ہر رات کو میں روتی رہتی ہوں یہاں تک کہ سو جاتی ہوں۔ (امریکہ میں ہر دو منٹ میں ایک کم عمر لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے)

پلین ٹروتھ کے مذکورہ شمارہ میں نیو یارک کے اخبار نویس جارج ڈون کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں ۱۵ سے ۱۹ سال کے درمیان کی ہر ایک ہزار لڑکیوں

میں ۹۶ لڑکیاں حاملہ پائی گئی ہیں ۔(صفحہ ۶)

یہ انجام ہے فطرت سے انحراف کرنے کا ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد اور عورت کی شکل میں بنایا ۔ پھر مرد اور عورت کے تعلق کا ایک نظام مقرر کیا ۔ وہ نظام یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک خاص عمر کو پہونچ کر نکاح کریں ۔ پھر وہ مل کر ایک گھر بنائیں ۔ اپنے بچوں کی تربیت اور پرورش کریں ۔ اس طرح انسانی نسل چلائی جائے ۔ مگر جدید مغرب نے آزادی کے تصور کو اتنا بڑھایا کہ عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو بھی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا ۔ اس کے نتیجہ میں مغرب کے معاشرہ میں بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئیں جن میں سے ایک وہ ہے جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے ۔

عورت اور مرد کے درمیان آزادانہ اختلاط اور بے قید تعلق فطرت کے سراسر خلاف ہے ۔ صنفی معاملہ میں عورت " وحدت " کو پسند کرتی ہے ۔ جب کہ مرد کا معاملہ طبعاً کسی قدر مختلف ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ آزادانہ صنفی تعلق وفادارانہ صنفی تعلق میں مانع بن جاتا ہے جو مرد سے زیادہ عورت کے لیے نفسیاتی ہلاکت کے ہم معنی ہے ۔ اس کی سب سے زیادہ قیمت عورت کو بھگتنی پڑتی ہے ۔

آسٹریلیا کی مشہور آزادی پسند خاتون مز جرمین گریر (Ms Germaine Greer) نے بڑی عمر کو پہونچ کر یہ اعتراف کیا ہے کہ نوجوانی کی عمر میں آزادیٔ نسواں کے لیے ان کا جوش وخروش حقیقت پسندانہ نہ تھا ۔ انھوں نے ایک انٹرویو (انڈین اکسپریس ۱۴ جنوری ۱۹۸۷) میں کہا :

> What is worrying today is the results of the sexual liberation movement —the number of teenaged girls who have been on the pill since they were 12 and 13, the number of teenaged girls who get pregnant by the time they are 15 and 16. What is happening to them? Sex means something quite different for men. They can love and leave. When the time comes to go to university, they can take off quite easily. Women have a different sensibility. They love with their heads, hearts and loins. And a broken love affair leaves them quite shattered. I have seen it happen to people close to me. And it is terrible.

آج جو چیز پریشان کن ہے وہ آزاد صنفی تحریک کے نتائج ہیں ۔ کم عمر لڑکیاں جو ۱۲ اور ۱۳ سال کی عمر سے مانع حمل گولیوں پر رہنے لگتی ہیں اور وہ لڑکیاں جو ۱۵ اور ۱۶ سال کی عمر میں حاملہ ہو جاتی ہیں، ان کے ساتھ کیا بیت رہی ہے ۔ صنفی تعلق مرد کے لیے کافی مختلف معنی رکھتا ہے ۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ محبت کریں اور چھوڑ دیں ۔ جب یونیورسٹی جانے کا وقت آتا ہے تو وہ نہایت آسانی

سے روانہ ہو سکتے ہیں ۔ عورتیں مرد سے مختلف حساسیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے دماغ، اپنے دل اور اپنے وجود کے ساتھ محبت کرتی ہیں۔ ایک ٹوٹا ہوا محبت کا رشتہ انھیں بالکل توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے یہ بات اپنے قریب کے لوگوں میں ہوتے ہوئے دیکھی ہے ۔ اور یہ دہشتناک ہے ۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سوسائٹی میں بھی بگاڑ پایا جاتا ہے اور مغرب کی سوسائٹی میں بھی ۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے ۔ مسلمانوں کا بگاڑ اسلامی اصولوں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ خود ان کے اصولوں پر عمل کی پیداوار ہے ۔

مصنوعی مسائل

کیلی فورنیا کے ایک کروڑ پتی رابرٹ گراہم (Dr Robert Graham) نے ایک انوکھا بینک قائم کیا۔ اس کا نام انھوں نے نوبیل اسپرم بینک (Nobel Spermbank) رکھا۔ اس "بینک" میں نوبیل انعام یافتہ افراد کے مادۂ منویہ کو حاصل کر کے محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے عورتوں کو بارآور کیا جائے اور زیادہ اعلیٰ ذہانت (Above-average intelligence) والے بچے پیدا کیے جائیں۔ بانی کا کہنا تھا کہ یہ بینک اس نے نااہل شوہروں (Infertile husbands) کے لیے قائم کیا ہے ۔ تاہم جدید خواتین کی اباحیت پسندی اس پابندی کو ختم کر رہی ہے ۔ بہت سی خواتین نکاح کے بغیر بچہ پیدا کرنا چاہتی ہیں، نیز وہ چاہتی ہیں کہ ان کی اولاد اعلیٰ استعداد کی مالک ہو، ایسی خواتین آزادانہ طور پر اس بینک کی خدمات حاصل کر رہی ہیں ۔

انھیں خواتین میں سے ایک کیلی فورنیا کی ڈاکٹر آفٹن بلیک (Afton Blake) ہے۔ اس کی عمر اس وقت ۴۴ سال ہے ۔ اس نے مذکورہ نوبیل اسپرم بینک سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اپنے لیے جس قسم کی اولاد چاہتی تھی ، اس کے مطابق اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ نمبر ۲۸ (Number 28) کا مادہ حاصل کرے ۔ واضح ہو کہ اس بنک میں جن لوگوں کے مادۂ منویہ جمع کیے گیے ہیں ان کو ان کے نام سے پکارا نہیں جاتا ۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو ایک نمبر دیا گیا ہے اور اسی خاص نمبر سے اس کو یاد کیا جاتا ہے ۔

ڈاکٹر بلیک "نمبر ۲۸" کے مادہ کو اپنے رحم میں داخل کر کے حاملہ ہوئی ۔ مقرر وقت پر اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اس نے ڈورون (Doron) رکھا۔ یہ یونانی

لفظ ہے جس کے معنی تحفہ یا عطیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ اب چار سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے اور وہ اب اسکول جانے لگا ہے۔ اس کی تصویر ہندستان ٹائمس ۷ ستمبر ۱۹۸۶ (میگزین صفحہ ۴) پر شائع ہوئی ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کا نمائندہ آئن بروڈی (Ian Brodie) مذکورہ خاتون سے اس کے لاس اینجلس (کیلی فورنیا) کے مکان پر ملا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر بلیک کی خوشیاں دھیرے دھیرے غم میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ باپ کے بغیر بچہ کی ولادت اس کے لیے طرح طرح کے مسئلے پیدا کر رہی ہے۔ ان مسائل کی طویل فہرست میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود اب بولنے لگا ہے۔ وہ بار بار پوچھتا ہے کہ میرے باپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر بلیک نے بتایا کہ ایک بار ایسا ہوا جب کہ ڈورون مجھ سے غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے:

There was one occasion when Doron got angry with me. He said he was going off to live with his dad.

خاتون کے لیے شوہر کے بغیر اولاد حاصل کرنا پہلے ایک دلچسپ تجربہ معلوم ہوتا تھا، مگر اب وہ نازک مسائل کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود ڈورون اپنے لیے ایک باپ سے محروم ہے:

One thing Doron is deprived of is a Daddy.

فطرت کے نظام سے انحراف کے بعد آدمی کے لیے ایسے عجیب و غریب مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا اس نے پہلے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مناکحت نہ کہ مسافحت

ٹائم (نیویارک) انگریزی زبان کا مشہور ہفتہ وار میگزین ہے۔ وہ دنیا کے تقریباً ۹۵ ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مجموعی طور اس کی اشاعت ۶ ملین ہے۔ (ٹائم ۲ فروری ۱۹۸۷)

اس میگزین کی ہر اشاعت میں ایک تحقیقی مضمون ہوتا ہے جس کو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ٹیم خصوصی ریسرچ کے ذریعہ تیار کرتی ہے۔ اس مضمون کو سرورق کا مضمون (Cover story) کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک مضمون اس کے شمارہ ۱۶ فروری ۱۹۸۷ میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے عظیم پژمردگی (The Big Chill) اس مضمون میں مختلف پہلوؤں سے اس نئی

بیماری کی تحقیق کی گئی ہے جس کو ایڈز (AIDS) کہا جاتا ہے۔

ایڈز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک متعدی مرض ہے۔ چنانچہ یہ مرض اب نئے قسم کے اچھوت پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ جو مرد یا عورت ایک بار ایڈز میں مبتلا ہو جائیں، لوگ ان سے دور بھاگنے لگتے ہیں، کیوں کہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ انھیں بھی یہ مرض لگ جائے گا۔ بعض مغربی ملکوں میں باربر شاپ پر اس قسم کے نشانات نظر آنے لگے ہیں جن کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ شیو کے لیے یہاں نہ آئیں:

No shaves here.

حکومتی ذمہ داروں نے اس کو ایڈز ہسٹریا کہا ہے۔ تاہم باربر حضرات کا کہنا ہے کہ مریض کے چہرہ کا پسینہ یا شیو کرتے ہوئے معمولی سا خون نکل آنا بھی بیماری کے پھیلنے کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے احتیاطی طور پر ایسے مریضوں سے بچنا ضروری ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ فروری ۱۹۸۷)

ٹائم کے محققین کی جماعت نے تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اس مہلک مرض کا سب سے بڑا سبب آزادانہ جنسی تعلق (Promiscuity) ہے۔ اسی بنا پر اس مرض کو رنڈی کا مرض (Gay disease) کہا جاتا ہے۔ یہ مرض بہت تیزی سے پھیلتا ہے۔ چنانچہ اس نے جدید دنیا میں جیومیٹرک انتشار (Geometric explosion) کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایڈز کی ہلاکت خیزی کو دیکھ کر ایک مبتلائے مرض نے کہا:

Oh, what will happen in this world if we have to die when we make love? AIDS is the century's evil (p. 32).

آہ، اس دنیا کا کیا ہوگا اگر ہمارا حال یہ ہو جائے کہ ہم کو محبت کرنے کے لیے مرجانا پڑے۔ ایڈز اس صدی کی آفت ہے۔

آزادانہ جنسی تعلق، جس کو مغرب میں خوبصورت طور پر آزادانہ محبت کہا جاتا ہے، وہ اب لوگوں کے لیے عذاب بنتا جا رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۹۱ تک امریکہ میں 270,000 افراد اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں گے۔ جن کا علاج کرنا امریکی ڈاکٹروں کے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے جو مخالف ایڈز مہم (Anti-AIDS campaign) چلائی

جارہی ہے، اس کا خاص نعرہ ہے ــــ احتیاط کے ساتھ محبت کیجئے :

Love Carefully

"احتیاط کے ساتھ محبت کیجئے" کی نصیحت کو اگر ہم لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہوگی کہ نکاح کے ساتھ محبت کیجئے، بے نکاح محبت کا طریقہ چھوڑ دیجئے۔

ڈی ایچ لارنس (D.H. Lawrence) کا ناول "لیڈی شیٹرلی کا محبوب" (Lady Chatterly's Lover) پہلی بار ۱۹۲۸ میں چھپا۔ اس میں آزادانہ جنسی تعلق کی وکالت کی گئی تھی۔ اس وقت اس ناول کو فحش سمجھا گیا اور جلد ہی اس کو بند (Ban) کر دیا گیا۔ اس کے بعد حالات بدلے اور ۱۹۵۹ میں دوبارہ اس ناول کو چھاپنے اور فروخت کرنے کی قانونی اجازت دے دی گئی۔ اس ناول نے امریکی نوجوانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے اندر آزادانہ جنسی تعلقات عام ہوگیے۔ مگر اب دوبارہ آواز اٹھ رہی ہے کہ اس ناول پر پابندی لگائی جائے۔

یہ ایڈز کا کرشمہ ہے۔ آزادانہ جنسی تعلقات نے ایڈز کی پُراسرار مگر حد درجہ مہلک بیماری پیدا کی ہے۔ اور اب مغرب کے لوگ مجبور ہو رہے ہیں کہ آزادانہ جنسی تعلق کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کریں (۲۴)

ٹائم کے الفاظ میں، ہر جنسی ترغیب پر دوڑنے والے لوگ، جلد یا بدیر، جنسی احتیاط اور پابندی کے ایک نئے دور کی حقیقت سے دوچار ہوں گے :

Swingers of all persuasions may sooner or later be faced with the reality of a new era of sexual caution and restraint (p. 24).

مذکورہ تبصرہ کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ فطرت کے حقائق انسان کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ آزادانہ جنسی تعلق کے طریقہ کو چھوڑ دے اور پابند جنسی تعلق کے طریقہ کو اختیار کرے۔

شریعتِ خداوندی میں عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلق کو نکاح کی قید کے ساتھ وابستہ کیا گیا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے آزادی پسند لوگوں نے کہا کہ یہ انسان کے اوپر غیر ضروری قسم کی پابندی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار لٹریچر شائع کیا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ممالک میں

آزادانہ جنسی تعلق ایک عمومی رواج کی صورت اختیار کر گیا۔

لوگ خوش تھے کہ انھوں نے شریعت اور مذہب کی پابندی سے آزاد ہو کر لامحدود عیش کا راز دریافت کر لیا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے ربع آخر میں پہونچ کر آزادانہ جنسی تعلق نے نئے نئے امراض پیدا کر دیئے۔ اور بالآخر "ایڈز" کی مہلک بیماری نے لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ شریعتِ خداوندی کا طریقہ ہی فطری طریقہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں آزادانہ جنسی تعلق انسانی صحت کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ٹائم میگزین کے مذکورہ شمارہ (صفحہ ۲۴) میں ایک مرد اور ایک عورت کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ ان کو ایک خوفناک سانپ نے چاروں طرف سے لپیٹ لیا ہے۔

قرآن میں ہدایت کی گئی تھی کہ عورتوں کے ساتھ جنسی تعلق قیدِ نکاح میں لاکر کرو نہ کہ بدکاری کے طور پر کرنے لگو (محصنین غیر مسافحین، مائدہ ۵) مفسرین نے قرآن کی اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے کہ عورتوں کے ساتھ نکاح کے ذریعہ تعلق قائم کرو نہ کہ زانی بن کر (یعنی متزوجین غیر زانین) تجربات نے بتایا کہ یہی طریقہ صحیح فطری طریقہ ہے۔ مناکحت اور مسافحت میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک اگر زندگی ہے تو دوسرا موت۔ ایک طریقہ انسانی سماج کے لیے رحمت ہے تو دوسرا طریقہ انسانی سماج کے لیے عذاب۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ مارچ ۱۹۸۷) نے ایڈز روک (AIDS Check) کے عنوان کے تحت ایک امریکی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی حکومت نے اپنے شہریوں کو بعض تدبیریں اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے جس کے ذریعہ وہ ایڈز کی مہلک بیماری سے بچ سکتے ہیں۔ ان تدبیروں میں سب سے زیادہ خاص تدبیر جنسی پرہیز ہے:

The US government has released its new education plan which stresses sexual abstinence as a preventive measure.

یہ واقعہ انسانی قانون پر خدائی شریعت کی برتری کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ خدائی شریعت کو ماننے والا ایک شخص اگر خدانخواستہ مسافحت کا طریقہ اختیار کرے اور اس کو ایڈز کی بیماری لگ جائے تو اس کو اصولِ شریعت سے انحراف کا نتیجہ کہا جائے گا۔ اس کے برعکس مغربی

تہذیب کا ایک انسان مسافحت کرکے ایڈز میں مبتلا ہو تو وہ عین اس کے اصول کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ پہلے واقعہ کی صورت میں ایک انسان کی غلطی ثابت ہوتی ہے جب کہ دوسرے واقعہ کی صورت میں خود تہذیب جدید کے اصول کی غلطی۔

غیر فطری مساوات کا نتیجہ

"کوئی شخص جو مجھ کو جانتا ہو وہ یقین نہیں کر سکتا کہ میں نے کیا کیا ہے۔" ایک ۳۵ سالہ امریکی نے کہا۔ جو کہ بظاہر ایک سنجیدہ اور معصوم چہرہ والا آدمی ہے۔ اس نے اپنی عورت کو مارنے کی کہانی بیان کی جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس نے گلا گھونٹ کر اس کو بے ہوش کر دیا۔ اس نے اس کو کیچڑ میں دھکیل دیا۔ اس نے چھری سے اس کا گلا کاٹ دینا چاہا، وغیرہ۔

"میں نے کیسے ایسا کیا؟" اس نے تعجب کے ساتھ کہا۔ "لوگ مجھ کو ایک اچھے آدمی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میرا اپنا ایک بزنس ہے، میں شراب نہیں پیتا، میں سگریٹ نہیں پیتا۔ میں دوسری عورتوں کا پیچھا نہیں کرتا۔" اس کے باوجود ایسا ہوا کہ اس شخص نے بار بار اپنی بیوی کو مارا۔

امریکی ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ (مارچ ۱۹۸۷) میں اس طرح کے بہت سے امریکیوں کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ ڈائجسٹ کے اس مضمون کا عنوان ہے۔ لوگ کیوں ان عورتوں کو مارتے ہیں جن سے وہ محبت کرتے ہیں:

Why Men Hurt The Women They Love

پانچ صفحہ کے اس مضمون میں عورتوں کو مارنے (Wife-beating) کی بہت سی مثالیں نقل کرتے ہوئے حسب ذیل رپورٹ دی گئی ہے:

According to one survey in America, a woman is battered by a husband or boy-friend every 18 seconds. And every year, it is estimated that more than a million of these women need medical help. Every day, four die (p. 135).

ایک جائزہ کے مطابق امریکہ میں ہر ۱۸ سکنڈ میں ایک عورت ماری جاتی ہے۔ کبھی اپنے شوہر کے ہاتھوں اور کبھی اپنے دوست لڑکے کے ہاتھوں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک

ملین سے زیادہ عورتوں کو ہر سال طبی امداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر ایک دن میں چار عورتیں مر جاتی ہیں۔

امریکہ کے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ میں عورتوں کو مارنے کی یہ برائی کیوں ہے۔ اس پر موجودہ زمانہ میں کافی تحقیق کی گئی ہے۔ مسز سوسن شسٹر (Susan Schechter) نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے عورتیں اور مردانہ تشدد (*Women and Male Violence*) ان کا جواب یہ ہے کہ یہ جابرانہ کنٹرول حاصل کرنے کی ایک صورت ہے:

It is a pattern of coercive control (p. 136).

ریڈرز ڈائجسٹ کی مذکورہ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے:

"Any batterer can tell you why he hit her," says Ellen Pence, director of the Domestic Abuse Intervention Programme. "He wanted control over her, he wanted his own way" (p. 140.)

کوئی بھی مارنے والا مرد آپ کو بتائے گا کہ اس نے عورت کو کیوں مارا۔ ڈی اے آئی پی کے ڈائرکٹر الن پنس نے کہا: "اس نے عورت کے اوپر کنٹرول حاصل کرنا چاہا۔ اس نے چاہا کہ اس کی اپنی مرضی چلے"

مذکورہ بیان کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ صورت حال براہ راست طور پر جدید مغربی تہذیب کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے عورت کو مرد کے برابر قرار دیا۔ اس نے عورتوں کے لیے علاحدہ روزگار کا انتظام کرکے انھیں یہ موقع دیا کہ وہ مردوں سے آزاد اپنی مستقل معاشی بنیاد حاصل کر سکیں۔ اس بنا پر عورتوں کے اندر برابری کا احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا۔ تاہم یہ احساس مصنوعی تھا۔ کیوں کہ مذکورہ معاشی بندوبست کے باوجود مغربی تہذیب کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ فطرت کی اس تقسیم کو بدل دے کہ مرد پیدائشی طور پر صنف قوی ہے اور عورت پیدائشی طور پر صنف ضعیف۔

اس مصنوعی مساوات کے نتیجہ میں ان ملکوں کی گھریلو زندگی ایک تضاد کا شکار ہوگئی۔ ان گھروں میں ایسی عورتیں رہنے لگیں جو اپنی جسمانی بناوٹ کے اعتبار سے تو مرد کے مقابلہ

میں اسی طرح کمزور تھیں جس طرح ہر دور کی عورتیں کمزور رہی ہیں۔ مگر مزاج کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو مردوں کا ہمسر سمجھ رہی تھیں۔ مرد صنف قوی ہونے کی وجہ سے عورتوں پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر عورتوں نے اپنے مصنوعی مزاج کی بنا پر کنٹرول قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کش مکش کا نتیجہ یک طرفہ طور پر عورتوں کے حق میں بُرا ثابت ہوا۔

عورت اور مرد دونوں اگر واقعۃً حیاتیاتی طور پر یکساں ہوتے تو کبھی مرد عورت کو مارتا اور کبھی عورت مرد کو مارتی۔ مگر چونکہ یہاں معاملہ یکسانیت کا نہ تھا، اس لیے وہی صورت پیش آئی جو خربوزے اور چھری کے ٹکراؤ میں پیش آتی ہے۔ مرد ہمیشہ مارنے والا ثابت ہوا۔ اور عورت ہمیشہ مار کھانے والی۔

اس معاملہ میں جدید عورت کی مظلومی اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بھاگ کر بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی۔ رپورٹ کے مطابق ایک عورت نے کہا کہ اگر کوئی عورت بھاگنا چاہے تو اس کا شوہر اس کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تم کو پکڑوں گا اور تمہیں مار ڈالوں گا۔ اکثر سنگین ضربیں اور موتیں اس وقت پیش آتی ہیں جب کہ عورتیں باہر بھاگ جانا چاہتی ہیں:

If you try to leave, a husband may threaten, "I'll find you and kill you." Many of the worst injuries and deaths happen as women try to get away (p. 137).

فطرت کی تقسیم میں مرد کو عورت کے اوپر قوام بنایا گیا ہے۔ اب اگر اس تقسیم کو مصنوعی طور پر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کا انجام وہی ہوگا جس کی ایک تصویر مذکورہ بالا رپورٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ جدید تہذیب سے پہلے کبھی ایسا نہ تھا کہ عورتیں اس طرح اپنے گھروں میں ماری جائیں۔ یہ صرف دور جدید کی خصوصیت ہے۔ اور یہ براہ راست طور پر اس مصنوعی نظریۂ مساوات کا نتیجہ ہے جو تاریخ میں پہلی بار مغربی تہذیب میں اختیار کیا گیا۔ تاریخ کے پچھلے دور میں بھی عورت کو مارنے کے واقعات ہوتے تھے مگر وہ استثنائی طور پر صرف نچلے طبقات میں پیش آتے تھے۔ لیکن جدید حالات نے ان کو بڑھا کر اعلیٰ طبقات کے دائرہ تک پہونچا دیا۔ اس نے ایسے واقعات کو مہذب انسانوں کا مسئلہ بنا دیا جب کہ اس سے

پہلے وہ صرف غیر مہذب انسانوں کے مسئلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

جدید عورت کی مظلومی

ایک سیاح امریکہ گیا۔ ایک بار وہ وہاں کے ایک کلب میں تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر رقص کر رہے تھے۔ سیاح کنارے کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ایک امریکی لڑکی آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اداس لہجے میں کہا : مسٹر سیاح، کیا میرے اندر گلیمر (Glamour) نہیں۔" "کیوں نہیں، تمہارے اندر تو گلیمر ہے۔" سیاح نے جواب دیا۔ "پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی لڑکا مجھے ڈیٹ نہیں دیتا۔" لڑکی نے کہا۔

ڈیٹ (Date) کے معنی انگریزی زبان میں تاریخ کے ہوتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں یہ لفظ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک رواج کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ ہے ایک صنف کا دوسری صنف کو کسی مقررہ تاریخ کو مدعو کرنا۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کا تجربہ کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ڈیٹ دے کر ایک دوسرے کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ مغربی زندگی میں یہ رواج اتنا زیادہ عام ہو گیا ہے کہ جس لڑکی کو کوئی لڑکا "ڈیٹ" نہ دے وہ اپنے آپ کو کچھ کم سمجھنے لگتی ہے۔ اس کا خیال یہ ہو جاتا ہے کہ شادی کے بازار میں اس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

ڈیٹنگ کا یہ طریقہ ابتداءً صرف گفت گو اور ملاقات تک محدود تھا۔ اب بڑھتے بڑھتے وہ باقاعدہ جنسی تعلقات تک پہونچ گیا ہے۔ مغربی لڑکوں کے لیے یہ ایک مہذب طریقہ بن گیا ہے کہ وہ ڈیٹ دے کر ایک لڑکی کو ایک تنہا کمرہ میں بلائیں اور پھر وہاں اس کے ساتھ جبری طور پر بدکاری کریں۔

اس سلسلہ میں امریکی میگزین ٹائم (۲۳ مارچ ۱۹۸۷) نے ایک سبق آموز رپورٹ شائع کی ہے۔ اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے : جب ڈیٹ زناکاری میں تبدیل ہو جائے۔

سوسن (Susan) ۲۲ سال کی ایک غیر شادی شدہ خاتون ہے۔ اس کی ملاقات ایک مرد سے ہوئی۔ جب دونوں رخصت ہونے لگے تو مرد نے اس کو ڈیٹ دی۔ اس کے مطابق دونوں ایک کمرے میں جمع ہوئے۔ ۴۵ منٹ تک وہ ٹیلی وزن دیکھتے رہے اور ادھر اُدھر کی باتیں

کرتے رہے۔ اس کے بعد مرد اس کے پاس آگیا اور آگے کے افعال کرنا شروع کر دیئے۔ عورت ٹھہرو ٹھہرو کہتی رہی۔ مگر مرد نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ تم محض تکلف میں ایسا کہہ رہی ہو، ورنہ حقیقۃً تم مجھ کو روکنا نہیں چاہتی ہو:

You really don't want me to stop.

اس کے بعد اس کمرہ میں وہ سب کچھ ہوا جس کو قانونی اصطلاح میں "زنا بالجبر" کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی ڈیٹ ریپ (Date rape) موجودہ ترقی یافتہ ملکوں میں عام ہو چکی ہے۔ ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنا، بعض محققین کے نزدیک، آج کا بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ کالج کے طلبہ کا جائزہ یہی بتاتا ہے جو کہ ۶۲۰۰ مردوں اور عورتوں کے درمیان ۳۲ کیمپس میں تین سال تک کیا گیا۔ ماہر نفسیات میری کاس نے پایا ہے کہ جن عورتوں کو اس قسم کے تجربات ہوئے جو کہ قانون کے مطابق زنا بالجبر کی تعریف میں آتے ہیں، ان میں آدھے سے زیادہ تعداد ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنے کی تھی۔ ایک لکچرر اینڈری پیرٹ نے اندازہ لگایا ہے کہ دو کیمپس جن کا اس نے جائزہ لیا، ان کی ۲۰ فیصد خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۵ میں زنا بالجبر کے واقعات کی تعداد ۸۷۳۴۰ تھی۔ میری کاس نے کہا: ڈیٹ کے موقع پر بدکاری کا خطرہ اس سے زیادہ ہے کہ اچانک جھاڑی سے نکل کر کوئی اجنبی شخص ایسا کرنے لگے۔ آزادی نسواں کے بعض علم برداروں کا کہنا ہے کہ امریکہ میں ایک بدکاری کلچر پیدا ہو چکا ہے جس میں مردوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ جارحانہ

When the Date Turns into Rape

Date rape, according to some researchers, is a major social problem, so far studied mostly through surveys of college students. In a three-year study of 6,200 male and female students on 32 campuses. Kent State Psychologist Mary Koss found that 15% of all women reported experiences that met legal definitions of forcible rape. More than half those cases were date rapes. Andrea Parrot, a lecturer at Cornel University, estimates that 20% of college women at two campuses she surveyed had been forced into sex during their college years or before, and most of these incidents were date rapes. The number of forcible rapes reported each year — 87,340 in 1985 — is believed to be about half the total actually committed. Says Koss: You're a lot more likely to be raped by a date than by a stranger jumping out of the bushes. Some feminists argue that the U.S. has a 'rape culture' in which males are encouraged to treat women aggressively and women are trained to submit (p. 35).

انداز اختیار کریں اور عورتیں ان کے آگے سپر ڈال دیں۔

مسٹر سری پرکاش (سابق گورنر مہاراشٹر اور پاکستان میں پہلے ہندستانی ہائی کمشنر) نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ میں انھوں نے ایک انگریز سے پوچھا کہ تم لوگ ـــــ ہم ہندستانیوں کو حقیر کیوں سمجھتے ہو۔ انگریز نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا اس میں سے ایک بات یہ تھی: "آپ لوگ شادی کے سلسلہ میں بہت سی پابندیاں ملحوظ رکھتے ہیں۔ یورپ کا نظریہ یہ ہے کہ نوجوان لڑکا اور لڑکی خود ایک دوسرے کو پسند کر کے شادی کرلیں۔ آپ کے یہاں ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ لوگ سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں (صفحہ ۱۷۲)

آزادیٔ نسواں کی تحریک کے آغاز میں یہ بات بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ مگر غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان سے ہر قسم کی پابندیوں کو اٹھانے کا نتیجہ آخر کار قبل از نکاح صنفی تعلقات اور پھر زنا بالجبر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس تجربہ نے بتایا کہ صنفی تعلقات کے معاملہ میں "پابندی" کا اصول ہی صحت مند اصول ہے۔ اس معاملہ میں "آزادی" کا اصول معاشرہ کو بربادی کے سوا اور کہیں نہیں پہونچاتا۔

ایک حدیث

"ڈیٹ" کا مذکورہ مغربی رواج اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ غیر شادی شدہ عورت اور مرد تنہائی میں ایک دوسرے سے ملیں اور جتنی دیر تک چاہیں ایک ساتھ اپنے اوقات گزاریں۔ اس رواج نے مغرب میں جو اندوہناک صورت حال پیدا کی ہے اس کو نظر میں رکھیے اور پھر مندرجہ ذیل حدیث پر غور کیجیے، تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے اس معاملہ میں جو اصول مقرر کیے ہیں وہ کس قدر بامعنی ہیں:

من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلایخلُوَنَّ بامرأۃ لیس معہا ذومحرمٍ منہا فانَّ ثالثہما الشیطان (احمد)	جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ ہرگز وہ کسی ایسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے جس کے ساتھ کوئی محرم موجود نہ ہو۔ کیوں کہ وہاں ان کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

غیر مرد اور عورت اگر تنہائی میں ملیں تو شیطان کو فوراً انھیں ورغلانے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن اگر ملاقات کے وقت کوئی محرم رشتہ دار بھی ساتھ موجود ہو تو شیطان کو ان کی نفسیات میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ ایک صورت میں ملاقات کسی حد پر نہیں رکتی۔ اور دوسری صورت میں ملاقات ایک حد پر رہتی ہے، وہ اس سے آگے جانے نہیں پاتی۔

پاکبازی کی اہمیت

موجودہ زمانہ میں صنفی اباحیت کا طریقہ بہت بڑے پیمانہ پر اختیار کیا گیا۔ مغربی دنیا میں نکاح سے پہلے جنسی تعلق قائم کرنا عام ہوگیا، حتی کہ اس کو ایک فلسفہ بنا دیا گیا۔ کہا گیا کہ مستقل شریک حیات کے انتخاب کے لیے یہ زیادہ محفوظ اور بہتر طریقہ ہے کہ پیشگی طور پر پوری طرح اس کا تجربہ کرلیا جائے۔ مرد اور عورت نکاح سے پہلے اسی طرح کھلے طور پر ایک دوسرے سے ملنے لگے جس طرح ایک مرد اور ایک عورت نکاح کے بعد آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

مگر یہ طریقہ فطرت سے ٹکرا گیا۔ تخلیقی نظام کی خلاف ورزی نے ایسے ایسے مسائل پیدا کیے جن کا حل موجودہ ڈھانچہ میں ناممکن نظر آنے لگا۔ ان نتائج نے لوگوں کے اندر نظرثانی کا ذہن پیدا کیا۔ حتی کہ اب خود وہی لوگ اس طریقہ کے مخالف ہورہے ہیں جو اس سے پہلے نہایت پرجوش طور پر اس کی حمایت کر رہے تھے۔

اس سلسلہ میں امریکہ کی ایک بڑی سبق آموز رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اے ایف پی (AFP) کے حوالہ سے ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۸۷) نے اس رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

The survey, conducted among more than 1,400 college students aged 18-19, reveals that young women are more attracted to male virgins than they were 10 years ago. The New York psychologist, Mr Srully Blotnick, whose company carried out the survey, said: "The male virgin may not make the best lover, but usually he's eager to learn — and he's the safest." The safest, that is, from the risk of AIDS and other sexually transmittable diseases. Mr Blotnick said it was the risk of sexually-related diseases that makes the male virgins so attractive to women. His latest survey showed that 22 per cent of college women now want their next lover to be a virgin, compared to just nine per cent 10 years ago.

ایک جائزہ جو ۲۰۰سے زیادہ کالج کے طلبار کے درمیان لیا گیا۔ جن کی عمریں ۱۸-۱۹ سال کی تھیں، بتاتا ہے کہ امریکہ کی نوجوان عورتیں ازدواجی تعلق کے لیے پاکباز مردوں کی طرف زیادہ راغب ہیں، جب کہ دس سال پہلے ایسا نہ تھا۔ نیویارک کے ماہر نفسیات مسٹر سرولی بلاٹنک جن کی کمپنی نے یہ جائزہ لیا ہے، انھوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ پاکباز مرد بہت اچھا محبت کرنے والا نہ ہو مگر عام طور پر وہ سیکھنے کا شوق رکھتا ہے اور وہ محفوظ ہے۔ وہ ایڈز اور دوسری متعدی جنسی بیماریوں کا خطرہ اپنے ساتھ لیے ہوئے نہیں ہوتا۔ مسٹر بلاٹنک نے کہا کہ یہ دراصل جنس سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کا خطرہ ہے جس نے پاکباز مرد کو عورتوں کی نظر میں اتنا زیادہ جاذب بنا دیا ہے۔ ان کے اس جائزہ نے بتایا ہے کہ کالج کی عورتوں میں اب ۲۲ فی صد وہ ہیں جو پاکباز مرد چاہتی ہیں، جب کہ دس سال پہلے اس قسم کی عورتوں کی تعداد صرف ۹ فی صد تھی۔

ہندستان ٹائمس (۱۹ مارچ ۱۹۸۷) نے امریکی نیوز ایجنسی کی اس خبر کو شائع کرتے ہوئے اس پر یہ سرخی قائم کی ہے: پاکباز مرد کی مقبولیت:

Male virgins in vogue

شادی کے لیے پاکبازی کی شرط طرفین کے لیے صنفی آزادی میں رکاوٹ تھی۔ چنانچہ آزادیٔ نسواں کی تحریک کے ابتدائی دور میں اس کا مذاق اڑایا گیا اور اس کو محض ایک مذہبی افسانہ قرار دیا گیا۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ یہ مذہبی افسانہ نہیں بلکہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے۔

اگر آپ اپنے لیے درست اور بے ضرر جوڑا چاہتے ہیں تو آپ کو پاکبازی کی شرط کو قبول کرنا پڑے گا۔ پاکبازی اس سے پہلے صرف ایک مذہبی حکم نظر آتی تھی، آج وہ صحت مند ازدواجی تعلق کے لیے ایک لازمی اصول کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ خدائی احکام کے مبنی برحقیقت ہونے کا یہ کیسا عجیب ثبوت ہے جو خود انسانی تجربہ نے موجودہ زمانہ میں فراہم کیا ہے۔ اس کے بعد بھی آدمی اگر خدائی شریعت کی اہمیت کو نہ مانے تو یہ اس کی دھاندلی ہوگی نہ کہ مبنی برحقیقت رویہ۔

سرپرستی سے محروم

ہفتہ وار ٹائم (۲۳ مارچ ۱۹۸۷) نے امریکہ کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے ـ بچوں کی خودکشی (Teen Suicide) اس رپورٹ میں دکھایا گیا ہے کہ امریکہ میں ۱۰ سال اور ۲۰ سال کے درمیان کی عمر کے نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ کے مقابلہ میں یہ تعداد اب تین گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ ۱۹۸۵ میں ایک لاکھ آبادی پر ساٹھ نوجوانوں (اور اتنے ہی بڑوں) نے خودکشی کی۔ یہاں ہم تین خواتین کے تاثرات درج کرتے ہیں جو امریکی بچوں کی خودکشی کے سلسلہ میں مذکورہ رپورٹ میں نقل کیے گیے ہیں:

> Says Barbara Wheeler, a suicide-prevention specialist in Omaha: "I don't think they think about being dead. They think it's a way of ending pain and solving a problem."
> "Everybody is in such a rush that we don't take the time to listen to our youngsters," says Elaine Leader, co-founder of a teen crisis hotline at Cedars-Sinai Medical Centre in Los Angeles. "When something like this happens, I think a lot about my kids," says Barbara O'Leary, a hostess at a local diner. "I have to hope I raised them right. These are the dangerous years. You don't always know what's going on inside their heads" (pp. 18–19).

باربرا وہیلر نے کہا کہ میرا یہ خیال نہیں کہ خودکشی کے وقت یہ بچے سمجھتے ہوں کہ وہ مرنے جا رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ درد کو دور کرنے اور مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ الین لیڈر نے کہا کہ ہر شخص اس طرح دوڑ بھاگ میں ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو سن سکیں۔ باربرا اولیری نے کہا کہ جب اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں اپنے بچوں کے بارہ میں بہت زیادہ سوچنے لگتی ہوں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں ان کو درست طور پر پرورش کرسکوں۔ یہ ان کی زندگی کے خطرناک سال ہیں۔ آپ ہمیشہ یہ جان نہیں سکتے کہ ان کے دماغ میں کس طرح کے خیالات گھوم رہے ہیں۔

ٹائم (۲۳ مارچ ۱۹۸۷) کی مذکورہ رپورٹ پڑھنے کے بعد کچھ امریکی باشندوں نے مذکورہ ہفت روزہ کے نام خطوط لکھے ہیں جو ٹائم (۱۳ اپریل ۱۹۸۷) میں چھپے ہیں۔ ایک مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ میرا دل ان خاندانوں کے لیے خون بہاتا ہے جن کے بچوں نے خودکشی کی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ میرے ۱۶ سال کے پوتے نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔ ہمارا خاندان زندگی بھر حیران

رہے گا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور ہم کبھی اس کو جان نہ سکیں گے ؛

> My heart bleeds for the families of the teen suicides. I know. My 16-year old grandson committed suicide by hanging. Our family will spend the rest of our lives wondering why, and we will never know.
>
> Eloise Gradin, Pensacola Beach, Florida.

ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان کیوں ہے۔ اس کی واحد وجہ ان کی اپنے سرپرستوں سے محرومی ہے۔ ان ملکوں میں خاندانی انتشار کا مسئلہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا ہے اور یہی چیز ہے جس نے نوجوانوں کے اندر خودکشی کا رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وہ خاندان کی شفقت سے محروم ہو کر پرورش پاتے ہیں، اور بڑے ہو کر طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ چیز بعض اوقات انھیں خودکشی تک پہونچا دیتی ہے۔

ان ملکوں میں خاندانی انتشار پیدا ہونے کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے ازدواجی زندگی کی بنیاد ذمہ داری کے بجائے لذت پر قائم کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازدواجی تعلق میں مستقل تقدس کی قدر باقی نہ رہی۔ لوگ لذّت کی خاطر ایک دوسرے سے ملنے اور لذت ختم ہونے پر ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق عام ہو گئی۔ طلاق کے بعد عورت ایک طرف چلی گئی اور مرد دوسری طرف۔ انھوں نے اس دوران میں جو بچہ پیدا کیا تھا، اس کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ وہ والدین کی موجودگی میں یتیم بن کر رہ گیا۔

اس کی دوسری وجہ ان ملکوں میں مشترک زندگی کا خاتمہ ہے۔ انھوں نے زندگی کا جو طرز اختیار کیا اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ بوڑھے ماں باپ دارالضعفاء میں بھیجے جانے لگے۔ مشترک خاندان میں دادا اور دادی ، نانا اور نانی بچوں کو سنبھالنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ مگر مغرب کی معاشرت میں ان لوگوں کا مقام گھر نہیں بلکہ وہ ضعیف خانے ہیں جو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ ایک اور صورت میں والدین کے ساتھ ہوا ہے۔ وہاں کے نظام کے مطابق مرد اگر کام کرتا ہے تو عورت بھی کام کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں بیشتر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ان کی ملاقات بمشکل صرف " اتوار " کے دن ہوتی ہے۔ گویا مغرب کا بچہ اپنے دادا اور دادی یا نانا اور نانی سے اس لیے محروم ہے کہ

وہ دار الضعفاء میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اور اپنے ماں باپ سے اس لیے محروم ہے کہ وہ دونوں کام کرنے کے لیے آفس چلے گئے ہیں۔ ایسے بچوں کا وہی انجام ہو سکتا ہے جو اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔

خاتون سنگر کی موت کے بعد

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ مارچ ۱۹۸۷) میں ایک رپورٹ جاپان کے متعلق شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کا عنوان ہے:

Suicide Easy Escape for Japanese Youth

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹ سال کے اندر کی عمر کے جاپانی نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھے ہیں۔ ۱۹۸۵ میں ایسے نوجوانوں کی تعداد ۵۵۷ تھی۔ جب کہ ۱۹۸۶ میں ان کی تعداد ۸۰۲ تک پہونچ گئی۔

خودکشی کرنے والے اکثر نوجوان وہ تھے جو عمارتوں کی چھتوں سے کود پڑے۔ یہ واقعہ اس کے بعد ہوا جب کہ ۱۸ سالہ خاتون پاپ سنگر یوکیکو اوکادا نے محبت میں ناکامی کے بعد ایک چھت سے کود کر اپریل ۱۹۸۶ میں اپنی جان دے دی تھی۔ نوجوانوں نے بھی اسی کی نقل کی۔ کچھ لوگ جنھوں نے اس طریقہ سے اپنی جان دی وہ مس اوکادا کی موت سے غم زدہ تھے۔ انھوں نے چاہا کہ وہ بھی موجودہ دنیا سے رخصت ہو جائیں اور جنت میں پہونچ کر اپنی دل پسند سنگر سے جا ملیں۔ کچھ لوگوں نے مرتے وقت ایسی تحریر چھوڑی جس میں مذکورہ پاپ سنگر خاتون کا نام لکھا ہوا تھا:

Many were youngsters who jumped from roofs of buildings after 18-year old pop singer Yukiko Okada used that method of killing herself in April 1986 because of an unhappy love affair. Some of the people who died killed themselves because they felt sorry for her (Miss Okada) and wanted to be in heaven with her. A few left notes mentioning the singer (p. 6).

یہ ان بے شمار نقصانات میں سے ایک نقصان ہے جو عورتوں کو "اسکرین" کی چیز بنانے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ عورت اگر گھر کو سنبھالے تو وہ نوجوان نسل کو زندگی دینے والی ثابت

Man-made dwarfism

Human babies are the most tender and weak of all the babies of living creatures. It, therefore, needs its parents' care and guidance for its physical and mental growth for a longer period. This is why nature has endowed parents with a special attraction for their offspring.

In the past, the separation of children from their parents was caused only by emergency situations—war or occasional premature death. In normal circumstances, it was taken for granted that the children would enjoy the protection of their parents for as long as they required it.

However, this exception has come to be a rule in modern, advanced societies. This is the outcome of the modern concept of life which has destroyed the sanctity of matrimony. Either the children are born out of wedlock or the couples get separated shortly after marriage. The result is one in both cases—alienation of children from their parents, because they are "orphaned" during the lifetime of their parents.

The increasing incidence of this kind of orphaning is creating complex problems in modern society, one of which has been termed "Deprivation Dwarfism". The following are exerpts from a recent report by Western medical experts on this subject:-

> "Lack of love can stunt children's physical growth, retard their intellect or even kill them."

Medical experts have called the affliction deprivation dwarfism, a disease that used to kill many children in orphanages.

Pediatricians say that as late as 1915 some 90 per cent of the children who died in Baltimore, Maryland (the United States) orphanages within the first year of admission did so because of lack of love.

In deprivation dwarfism a child does not sleep properly and has trouble with his bowels.

Just as the human body can become dwarfed, so can the human spirit. The only cure for this is the tender, loving care which is engendered by love. There is no substitute for it, and the greatest love of all is the love of God.

ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر سے باہر نکل کر لوگوں کی تفریح کا سامان بنے تو وہ نوجوان نسل کو ہلاکت سے دوچار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

فطرت سے دور ہوکر

انسان کا بچہ تمام جانداروں کے بچے میں سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے۔ اس کو جسمانی پرورش اور ذہنی تربیت دونوں مقصد کے لئے لمبے عرصہ تک اپنے ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر اپنے بچے کے لئے خصوصی کشش رکھی ہے۔

قدیم زمانہ میں کسی بچے کے لئے اپنے باپ یا ماں سے محروم ہونا صرف ہنگامی اسباب سے ہوتا تھا۔ جنگ یا کسی اتفاقی حادثے سے قبل از وقت موت۔ عام حالات میں یقین کیا جاسکتا تھا کہ بچوں کو اپنے والدین کی سرپرستی پختگی کی عمر تک حاصل رہے گی۔

جدید ترقی یافتہ سماج میں یہ استثنا اب عموم بن گیا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے جدید تصور زندگی کا جس نے نکاح کے رشتہ کو غیر مقدس بنادیا ہے۔ اب یا تو نکاح کے بغیر لڑکے پیدا ہوتے ہیں یا نکاح کے جلد ہی بعد طلاق کی شکل میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے ــــ بچوں کی اپنے ماں باپ سے جدائی۔ بچوں کا اپنے والدین کے جیتے جی یتیم ہو جانا۔

اس بڑھتی ہوئی "یتیمی" نے جدید معاشرہ کے لئے طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا کر دئے۔ اس میں سے ایک وہ ہے جس کو محرومی کا بونا پن (Deprivation dwarfism) کا نام دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مغرب کے طبی ماہرین کی ایک تازہ رپورٹ (ایوننگ نیوز ۲۷ جون ۱۹۸۴) سامنے آئی ہے۔

اس رپورٹ میں مغربی طرز حیات کے نتائج کے بارہ میں بہت سے انکشافات کیے گیے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ سے محرومی کی بنا پر جن بچوں کو ابتدائی عمر میں محبت نہیں ملتی ان میں مختلف قسم کا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جسمانی نشو ونما میں کمی۔ دماغ کا ہلکا پن۔ حتی کہ یہ چیزیں بعض اوقات ان کی قبل از وقت موت کا باعث ہو جاتی ہیں۔

محرومی کا بونا پن نامی بیماری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا، اس کا نظام ہضم ٹھیک طرح کام نہیں کرتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسپتالوں میں جہاں چھوٹے بچے بیڈ پر ڈال دئے جاتے ہیں، پیٹھ کے بل دیر دیر تک پڑے رہنے سے ان کے سر کا پچھلا حصہ گنجا ہو جاتا ہے کیوں کہ وہاں کوئی ماں بار بار کروٹ بدلنے کے لئے موجود نہیں ہوتی۔ ماں باپ سے محروم ہوکر دار الاطفال میں پرورش پانے والے

بچے اپنے ذہنی اور جسمانی ارتقاء سے محروم رہتے ہیں۔

ڈاکٹر گارڈنر (Dr. Gardner) کا کہنا ہے کہ مطالعہ بتاتا ہے کہ دماغ کی اعلیٰ سطح سے ارتعاشات (Impulses) اٹھتے ہیں۔ یہ ارتعاشات جسمانی نظام میں داخل ہو کر مختلف قسم کے ہارمون پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جو زندگی کی نشو ونما کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جو پروٹین کو شکر میں تبدیل کرتا ہے۔ ماں باپ کی محبت سے محروم ہو کر جو بچے پرورش پاتے ہیں ان میں یہ قدرتی عمل کم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا جسم حاصل شدہ پروٹین کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتا جو ان کے نشو ونما کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت کے راستہ سے ہٹنا کس قدر تباہ کن ہے۔ انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی دوسری دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اسی دنیا کے ساتھ مطابقت کرے۔ اگر وہ فطرت کی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے لئے کوئی دوسری شاہراہ بنانا چاہے گا تو وہ صرف ناکامی اور بربادی پر ختم ہوگا۔ اس کے سوا اس کا کوئی انجام نہیں۔

بے قیدی کا تجربہ

امریکی میگزین نیوز ویک (۲۱ جنوری ۱۹۸۵) صفحہ ۳۵ پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں امریکی خواتین کا ایک جلوس دکھائی دے رہا ہے۔ جلوس کے آگے ایک نوجوان عورت ایک بینر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

Keep your laws and your morality off my body

اپنے قوانین اور اپنے اخلاق کو میرے جسم سے دور رکھو۔

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے لوگ اس وقت دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک وہ جو کھلے عام اسقاط کے قائل ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو "اسقاط نواز" نہ کہہ کر اپنے کو انتخاب نواز (Pro-choice) کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو اسقاط کا مخالف ہے وہ اپنے آپ کو زندگی نواز (Pro-life) کہتا ہے۔

جدید مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو سب سے بڑی چیز دریافت کی ہے وہ آزادی ہے۔ مگر بے قید آزادی کا تجربہ جو جدید مغرب میں ہوا وہ بتاتا ہے کہ آزادی خیر اعلیٰ نہیں ہو سکتی۔

آزادی اگر خیراعلیٰ ہو تو وہ اس قبیح انجام تک کیسے پہنچ جاتی ہے جس کا ایک نمونہ اوپر کے اقتباس میں نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی بے حد قیمتی چیز ہے۔ مگر انسان کے لئے خیراعلیٰ پابند آزادی ہے نہ کہ مطلق آزادی۔ یعنی انسان کے مقابلہ میں آزادی مگر خدا کے مقابلہ میں پابندی۔

انسان خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جہاں تک اپنے جیسے انسانوں کا تعلق ہے، ان کے مقابلہ میں بلاشبہ ہر انسان کو کامل آزادی حاصل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری شدید تر حقیقت یہ ہے کہ خدا کے مقابلہ میں انسان مکمل طور پر پابند ہے۔ خدا کے مقابلہ میں کسی انسان کو کوئی آزادی حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو اپنی آزادی کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ وہ ہر حال میں خدا کے احکام کا پابند رہے۔ یہی پابندی آزادی کے صحیح استعمال کی ضمانت ہے۔

خاتون لیڈر کا اعتراف

امریکہ کی مشہور ناول نگار خاتون اور تحریک نسواں کی لیڈر رہوڈا لرمن اپریل ۱۹۸۷ میں ہندستان آئیں۔ یہاں نئی دہلی میں انھوں نے ٹائمس آف انڈیا کے ایک اسٹاف رپورٹر کو انٹرویو دیا۔ یہ انٹرویو اخبار مذکور کے شمارہ ۳۰ اپریل ۱۹۸۷ میں شائع ہوا ہے۔ یہ پورا انٹرویو علحدہ صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

رہوڈا لرمن نے کہا کہ میں بہت بری خبر لے کر آئی ہوں۔ سماج میں عورت کے بدلتے ہوئے کردار پر بولتے ہوئے انھوں نے انکشاف کیا کہ امریکہ کے غریبوں میں ۷۷ فی صد تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اس کا سبب وہ غیر معمولی فرق ہے جو مردوں اور عورتوں کی کمائی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کمائی ۶۲ فی صد ہے۔ صرف اس لیے کہ انھیں ہلکے قسم کے کام دیئے جاتے ہیں۔ یکساں مواقع اور یکساں تنخواہ یکساں کام کے لیے محض ایک افسانہ ہے۔ عورتیں ابھی تک صرف نچلے اور درمیانی انتظامی شعبوں میں داخل ہو سکی ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ یہ امتیاز مردانہ تعصب کی بنا پر ہے جو کہ عورتوں کے خلاف کام کر رہا ہے۔ مردوں کا کہنا ہے کہ عورتوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ وہ زچگی کی چھٹی لیتی ہیں اور بچے

A Pyrrhic Victory

"I come with very bad news," says Rhoda Lerman, American novelist and a leader of the women's movement. Speaking on the changing role of women in society, she revealed that 77 per cent of the poor in America are women and children.

The reason she offers is the high wage differential between the earnings of men and women. Women earn 62 per cent of what men earn, merely because of the "pink-collared" jobs offered to them. "Equal opportunities and equal pay for equal work are just a myth," she declares. Women, by far have been able to infiltrate only the lower and middle management and are offered innumerable jobs in food chains and the secretarial cadres.

This discrimination, she believes is due to the male bias which works against women, branding them as "undependable, since they go in for maternity leave and have children." Although 96 per cent of the working women have children, only 67 per cent of them can enjoy maternity leave, without fear of jeopardising their jobs. However, seniority almost always suffers, says Ms Lerman. "Maternity and child care are the cause of high wage differentials", she adds, "economic reality having nothing to do with spiritual equality." Activists had clamoured for sexual equality and abortion rights and won them, without anticipating the economic backlash that would ensue.

With radical feminism accepted as the code, women are treated as equal, without any concessions to their biological differences. For instance, one out of two marriages in America are ending in divorce, with the responsibility of child care devolving on the mother alone. Alimony and maintenance are merely laws, rarely put into practice. A mere 5-10 per cent of the men pay maintenance, and that too, only for the first year.

For the rest, the burden is borne solely by the mother. Thus, the quality of life of a divorce woman reduces by 73 per cent and that of a man increases by 43 per cent.

Single households, headed by women trying to play the role of "supermoms", are on the increase, she revealed. In the next 10 years, therefore, 40-50 per cent of the children will be living in female-headed households. An unhealthy phenomenon, which has its repercussions in increased suicides amongst children. "Due to a lapse in the dependency structure, suicide is becoming endemic amongst children," she said.

Socialist feminism, which takes into account the intrinsic differences between men and women, is the call of the hour, Ms Lerman believes. We have had an excess of the American dream — of a husband who works, a house in the suburbs, two children, two cars and a mother who stays at home and bakes cookies.

With the family structure falling apart, she feels that only government support in the form of day-care centres, maternity leave benefits and subsidies to override the economic limitations of single women can hold the social fabric together. "Otherwise, our victories will be merely pyrrhic victories", she predicts. Similar, perhaps to the freedom experienced on the funeral pyre.

The Times of India, New Delhi, April 30, 1987

پالتی ہیں۔ اگرچہ ۹۶ فی صد کام کرنے والی عورتوں کے یہاں بچے ہیں، ان میں سے صرف ۶۷ فی صد اس اندیشہ کے بغیر زچگی کی چھٹی سے فائدہ اٹھا پاتی ہیں کہ اس سے ان کی ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم سینیرٹی کا نقصان انھیں ہمیشہ اٹھانا پڑتا ہے۔ زچگی اور بچوں کی پرورش تنخواہوں میں زبردست فرق کا سبب ہیں۔ معاشی حقیقت روحانی برابری سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ آزادیٔ نسواں کے علم برداروں نے جنسی برابری اور اسقاط کے حق کے لیے شور وغل کیا اور اس کو حاصل کرلیا، وہ اس معاشی تباہی کا اندازہ نہ کرسکے جو کہ اس کے بعد آنے والی تھی۔

انقلابی نسوانی تحریک کے تحت عورت اور مرد برابر مان لیے گیے ہیں، مگر عورت کو اس کے حیاتیاتی فرق کی کوئی رعایت نہیں ملی۔ مثال کے طور پر، امریکہ میں ہر دو شادی میں سے ایک شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچہ کی پرورش کی ذمہ داری تنہا عورت پر آجاتی ہے۔ نفقہ اور گزارہ محض لفظی قوانین ہیں، وہ بہت ہی کم عمل میں آتے ہیں۔ صرف ۵ سے ۱۰ فی صد تک ایسے مرد ہیں جو گزارہ ادا کرتے ہیں، اور وہ بھی صرف پہلے سال تک۔ بعد کے سالوں میں پورا بوجھ صرف ماں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح زندگی کا معیار ایک مطلقہ عورت کے لیے ۷۳ فی صد تک گھٹ جاتا ہے، اور مرد کا اس کے مقابلہ میں ۴۲ فی صد بڑھ جاتا ہے۔

ایسے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے جن میں صرف عورت ذمہ دار ہو اور وہ تنہا ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کرے۔ چنانچہ اگلے دس برسوں میں ۴۰ تا ۵۰ فی صد بچے وہ ہوں گے جو ایسے گھروں میں پرورش پائیں گے جن کی ذمہ دار صرف عورت ہو۔ یہ ایک غیر صحت مندانہ مظہر ہے جس کے نتیجہ میں بچوں میں خودکشی کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ خاندانی نظام میں انحصار کے فقدان کی وجہ سے خودکشی بچوں کی خصوصیت بن رہی ہے۔

اشتراکی نسوانیت جو کہ مرد اور عورت کے درمیان پائے جانے والے ناگزیر فرق کو ملحوظ رکھتی ہے آج وقت کی پکار ہے۔ امریکی زندگی کے بارہ میں (ابتداءً) ہمارا ایک بڑھا ہوا خواب تھا ـــــ ایک شوہر جو کام کرے، شہر کے کنارے ایک مکان، دو لڑکے، دو کاریں اور ماں جو گھر پر رہے اور کیک بنائے (مگر آزادی نسواں کی تحریک نے اس خواب کو منتشر کردیا)

خاندانی نظام کے ٹوٹنے کے بعد صرف حکومت کی مدد ہی مسئلہ کو حل کر سکتی ہے۔ حکومت کی طرف سے بچوں کی نگہداشت کے لیے مراکز ہوں، زچگی کی چھٹی کی سہولت ہو اور تنہا عورت کی معاشی کمیوں کی تلافی کے لیے اس کو مدد دی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری فتوحات جھوٹی فتوحات بن کر رہ جائیں گی یا ویسی ہی آزادی جس کا تجربہ چیتا کے اوپر ہوتا ہے۔

امریکہ کی خاتون لیڈر نے مذکورہ بیان میں اعتراف کیا ہے کہ تحریک نسواں کی کامیابیاں پرک فتوحات (Pyrric Victories) بن کر رہ گئی ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی بادشاہ تھا جس کا نام پرہس (Pyrrhus) تھا۔ اس نے ۲۸۱ ق م میں اٹلی پر حملہ کیا۔ لمبی جنگ کے بعد اس کو فتح حاصل ہوئی۔ مگر فتح تک پہونچتے پہونچتے وہ اپنا سب کھو چکا تھا۔ چنانچہ بعد کو ۲۷۵ ق م کی جنگ میں اس کو دوبارہ شکست ہوئی۔ ۲۷۲ ق م میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ پرک وکٹری اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس کا مطلب ہے ——— ایسی فتح جو بربادی لے کر آئے۔

یہ صحیح ترین لفظ ہے جو جدید عورت کی فتح کے بارہ میں بولا جا سکتا ہے۔ جدید عورت نے لمبی جد و جہد کے بعد "مساوات" حاصل کی۔ مگر اس خیالی مساوات کو حاصل کرنے تک وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ مذکورہ خاتون کا کہنا ہے کہ مغربی عورت کی محرومی کی تلافی کی اب صرف ایک صورت ہے۔ یہ کہ حکومت اس کی سرپرست بن جائے، وہی حکومت جو آج بھی پوری طرح مردوں کے قبضہ میں ہے۔ گھریلو مرد کی سرپرستی پر عورت راضی نہ تھی۔ اس کی قیمت میں عورت کو حکومتی مرد کی سرپرستی پر راضی ہونا پڑا۔

دو مثالیں

آزادی کے مصنوعی تصور نے مغربی گھروں میں جو مسائل پیدا کیے ہیں، ان کا تعلق صرف نچلے یا درمیانی طبقہ کے لوگوں سے نہیں ہے۔ اس کے برے اثرات اونچے خاندانوں اور نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں تک پہونچے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں ہم دو مثالیں نقل کریں گے۔

حال میں آئن سٹین کے کچھ خطوط ملے ہیں۔ یہ خطوط اس نے ایک عورت (میلیوا میرک)

کے نام لکھے تھے جو بعد کو اس کی پہلی بیوی بنی۔ یہ خطوط ان کے تعلقات کی خوشی اور غم کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ یہ خطوط آئن سٹین کی تحریروں کے مجموعہ کے لیے مواد کی تلاش کے دوران حاصل ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے:

The Collected Papers of Albert Einstein

میلیوا میرک (Mileva Maric) کی عمر آئن سٹین سے چار سال زیادہ تھی۔ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً آئن سٹین کی ماں اس رشتہ پر راضی نہ تھی جس کی بنا پر انھیں مایوسی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ بعد کو آئن سٹین اور میلیوا کا نکاح ہوا۔ تاہم نکاح سے پہلے ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ لڑکی کے ساتھ کیا پیش آیا۔ بظاہر وہ آئن سٹین کے ساتھ کبھی نہیں رہی۔ آئن سٹین اور مس میرک کی ملاقات ۱۸۹۶ میں فیڈرل ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ (زیورک) میں ہوئی تھی۔ ان کا نکاح جنوری ۱۹۰۳ میں ہوا۔ یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور ۱۹۱۹ میں ان کے درمیان طلاق ہو گئی:

They were married in January 1903, and
their marriage ended in divorce in 1919.

The Times of India, May 5, 1987

دوسری مثال موجودہ برطانی ولی عہد چارلس کی ہے۔ مسز پینی جونر نے حال میں پرنس چارلس کی سوانح عمری شائع کی ہے۔ اس میں وہ کہتی ہیں کہ پرنس چارلس نے ایک غلط عورت سے شادی کی۔ اس سلسلہ میں بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پرنس چارلس ایک غم زدہ شخص ہیں۔ وہ زمین پر بالکل تنہا ہو کر رہ گیے ہیں۔ ایک بیوی سے جو مدد

Charles, Diana Misfits

Prince Charles, heir to the British throne, married the wrong woman, said his biographer, Mrs Penny Junor in a recent interview with the BBC. Charles, she said, was a sad character with the loneliest position on earth. He did not have the support he should have from a wife. Prince Charles and Princess Diana were growing more and more apart. Mrs Junor said she had drawn her conclusions after talking to people who were close to him. "The palace has seen what I have written and the conclusions I have come to. No one has told me that I am on the wrong lines."

ملنی چاہیے وہ انھیں حاصل نہیں۔ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈائنا ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتے جارہے ہیں۔ مسز جونز نے کہا کہ انھوں نے یہ نتیجہ ان لوگوں سے بات کرکے حاصل کیا ہے جو شہزادہ سے جہت قریب ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اور جو نتیجہ نکالا ہے اس کو شاہی محل دیکھ چکا ہے۔ محل کے کسی آدمی نے نہیں کہا کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔

(ٹائم (نیو یارک) ۱۱ مئی ۱۹۸۷، ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۲۹ اپریل ۱۹۸۷)

ناقابل اعتماد کردار

ٹائم (نیو یارک) نے اپنے شمارہ ۲۵ مئی ۱۹۸۷ میں پنٹاگان سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے ـــــ جنس کا تعلق رازداری سے :

Mixing Sex And Secrets

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکی ادارہ پنٹاگان ۷ر۲ ملین لوگوں کے جنسی اعمال کی بابت محکمہ دفاع کے سیکوریٹی کلیرنس کے معاملہ میں پریشان ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ میں پنٹاگان نے اپنے ضوابط کی توسیع کرتے ہوئے فوج کے لوگوں، شہری کارکنوں اور ٹھیکہ کے ملازموں پر یہ شرط عائد کردی ہے کہ وہ کلیرنس کے تحت یہ بتائیں کہ کیا وہ جنسی اعمال مثلاً زنا، اغلام اور محرّمات کے ساتھ مباشرت میں مبتلا رہے ہیں۔ ان قوانین کا مقصد یہ اطمینان حاصل کرنا ہے کہ وہ لوگ جن کی پہونچ حکومت کے رازوں تک ہے ان میں یہ کمزوری نہیں ہے کہ ان کو بلیک میل کیا جاسکے :

> The Pentagon has been fretting about the sexual practices of the 2.7 million people with Defense Department security clearances. In January (1987) the Pentagon expanded its rules to compel service personnel, civilian workers, and contract employees with clearances to divulge workers and contract employees with clearances to divulge whether they have engaged in such sexual acts as adultery, sodomy and incest. The rules are intended to ensure that those with access to secrets are not vulnerable to blackmail (p. 29).

اباحیت پسند لوگوں کا دعویٰ تھا کہ نکاح سے باہر جنسی تعلقات محض "گناہ" ہیں۔ یعنی

وہ خدا کے نزدیک بُرے ہوسکتے ہیں، مگر انسانی معاملات میں ان سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ مگر تجربات نے بتایا کہ جو شخص جنسی تعلق کے معاملہ میں نکاح کے حدود کا پابند نہ ہو وہ ایک ناقابل اعتماد شخص بن جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا اخلاقی رخنہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے داخل ہو کر دشمن ہمارے نازک ترین رازوں تک پہونچ جائے۔

ایک مثال

مسٹر گاری ہارٹ (Gary Hart) امریکہ کے صدارتی الکشن (۱۹۸۷) کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار تھے۔ تمام اندازوں کے مطابق ان کی کامیابی یقینی تھی۔ مگر اس درمیان میں ایک واقعہ ہوا۔ اس کے بعد امریکہ میں اتنا طوفان اٹھا کہ مسٹر ہارٹ کو صدارت کے مقابلہ سے استعفا دینا پڑا۔

۵۰ سالہ مسٹر ہارٹ الکشن کی مہم میں مصروف تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک ملین ڈالر سے زیادہ قرض لیا تھا۔ اس درمیان میں ہفتہ کا آخری دن گزارنے کے لیے یکم مئی کو وہ خاموشی کے ساتھ میامی پہونچے۔ یہاں انھوں نے ایک ۲۹ سالہ ایکٹرس مس ڈونا رائس (Donna Rice) کے ساتھ ایک دن اور ایک رات گزاری۔ اس کی خبر ایک امریکی اخبار میامی ہیرالڈ (*The Miami Herald*) کو ہوگئی۔ اس نے اپنی ۳ مئی ۱۹۸۷ کی اشاعت کے صفحہ اول پر یہ کہانی حسب ذیل سنسنی خیز سرخی کے ساتھ چھاپ دی:

Miami woman is linked to Hart.

اس کے فوراً بعد ریڈیو، ٹیلی وزن، اخبارات ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔ مسٹر ہارٹ کی تصویریں مس ڈونا رائس کے ساتھ چھپنے لگیں۔ مسٹر ہارٹ جہاں جاتے وہاں ان سے پوچھا جاتا کہ کیا وہ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مسٹر ہارٹ عوامی عدالت میں زناکاری کے ملزم کی حیثیت سے کھڑے کر دیئے گیے:

Hart stood in the public dock accused of adultery (p. 6).

میامی ہرالڈ میں اگر یہ خبر چھپتی کہ مسٹر ہارٹ فلاں مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رات بھر رہے تو کوئی اس پر دھیان نہ دیتا۔ مگر اخبار نے جب یہ خبر چھاپی کہ مسٹر ہارٹ نے میامی کے فلاں مکان

میں ایک غیر عورت کے ساتھ زنا کاری گزاری تو ہر طرف ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ واقعہ اس بات کا تجرباتی ثبوت ہے کہ غیر عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ اگر یہ فعل انسانی فطرت کے خلاف نہ ہوتا تو ہنگامہ کرنے والے کبھی اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

مسٹر ہارٹ نے اس مصیبت سے بچنے کے لیے اپنی ساری ذہانت صرف کر دی۔ پہلے انھوں نے انکار کیا۔ پھر ٹالنے والے جوابات دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی بیوی لی ہارٹ (Lee Hart) کو راضی کیا کہ وہ ۱۳۰۰ میل کا سفر طے کر کے ہیم شائر سے ڈنور (Denver) پہونچیں اور اخبار نویسوں کے سامنے اپنا یہ بیان دیں کہ یہ بات اگر مجھے پریشان نہیں کرتی، تو میں نہیں سمجھتی کہ کسی اور کو اس سے پریشان ہونا چاہیے:

If it doesn't bother me, I don't think it ought to bother anyone else (p. 7).

مسٹر ہارٹ نے جب دیکھا کہ معاملہ کو چھپانے کے بارہ میں ان کی ساری تدبیروں کے باوجود راز کھل گیا ہے تو آخر کار انھوں نے اعتراف کر لیا۔ اب انھوں نے کہا کہ زنا کوئی قانونی جرم نہیں ہے۔ وہ صرف ایک گناہ ہے۔ اور وہ میرے اور میری بیوی اور میرے اور خدا کے درمیان ہے:

Adultery is not a crime. It's a sin. And that is between me and Lee, and me and God (p. 7).

تاہم مسٹر ہارٹ کی یہ باتیں امریکی عوام کو مطمئن نہ کر سکیں۔ اوپینین پول میں اس سے پہلے امکانی صدر کی حیثیت سے ان کا نام سر فہرست رہتا تھا۔ اب پول کے ذریعہ عوام کی پیشگی رائے معلوم کی گئی تو اچانک ان کا نام بالکل نیچے آ گیا۔ اس کے بعد مسٹر ہارٹ نے اپنے آپ کو ملک میں تنہا پایا:

And in the end he found himself alone (p. 10).

ٹائم (۱۸ مئی ۱۹۸۷) کے الفاظ میں ایکٹرس سے جنسی تعلق ان کے لیے ان کی سیاسی موت (Political death) کے ہم معنی بن گیا۔ ۳ مئی کو اس معاملہ کا انکشاف ہوا اور صرف پانچ دن

بعد ۸ مئی کو انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ صدارتی مقابلہ سے علٰحدگی کا اعلان کر دیا :

I was withdrawing from the race. ; ‹d then quietly disappear from the stage (p. 6).

ٹائم نے اس سلسلہ میں اپنی طویل رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ امریکی اب اپنے لیڈروں کے بارہ میں وہی گہری معلومات جاننا چاہتے ہیں جو کسی وقت کلارک گیبل (ایکٹر) اور ایلزبیتھ ٹیلر (ناول نگار) کی رومانیت کے لیے مخصوص تھیں۔ ہتھیاروں کے کنٹرول کے مسائل سے نبرد آزما ہونے اور معاشی مسائل سے نمٹنے سے زیادہ امریکی عوام ایسے افراد چاہتے ہیں جن پر وہ بھروسہ کر سکیں۔ جن کا فیصلہ اور جن کی دیانت داری ان کے لیے اطمینان بخش ہو :

Americans now demand the same intimate knowledge about their leaders that once was reserved for the romantic entanglements of Clark Gable or Elizabeth Taylor. Rather than wrestling with the complexities of arms control and a troubled economy, the public tends to look for personalities they can trust, whose judgement and integrity make them feel comfortable (pp.7–8).

یہی بات سابق صدر امریکہ لنڈن جانسن کے پریس سکریٹری جارج ریڈی (George Reedy) نے اس طرح کہی کہ صدارت کے امیدوار کے لیے جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس کا کیرکٹر ہے۔ اور یہ سب سے زیادہ عورتوں کے ساتھ اس کے تعلق کے معاملہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس عہدہ پر ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو آپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے بنک اکاونٹ کے معاملہ میں اس پر بھروسہ کریں، اسی طرح آپ کے بچوں، آپ کی زندگی اور آپ کے ملک کے معاملہ میں بھی چار سال تک۔ اگر خود اس کی اپنی بیوی اس پر اعتماد نہ کر سکے تو یہ بات کس چیز کا پتہ دیتی ہے :

What counts with a candidate for President is his character, and nothing shows it like his relationship with women. Here you have a man who is asking you to trust him with your bank account, your children, your life and your country for four years. If his own wife can't trust him, what does that say? (p. 15.)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرے کہ وہ نکاح کے دائرہ سے باہر جنسی تعلق قائم کرے، وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے اندر ذہنی ڈسپلن نہیں ہے۔ وہ اپنے جذباتی محرکات پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایسا شخص اپنے کردار کے اعتبار سے ہرگز اعتبار کے قابل نہیں۔ اس کے اندر ایک ایسی نفسیاتی کمزوری ہے جس کی بنا پر شدید اندیشہ ہے کہ وہ اپنی کسی ذاتی خواہش کے لیے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو قربان کردے۔ ایسا شخص عام زندگی میں بھی بھروسہ کے قابل نہیں، کجا کہ ریاست کے اعلیٰ منصب کے لیے اس پر بھروسہ کیا جائے۔

تجربات بتاتے ہیں کہ جنسی تعلقات کے معاملہ میں خدائی حد کو توڑنا سادہ معنوں میں صرف ایک مذہبی برائی نہیں ہے، وہ مہلک قسم کی سماجی برائی بھی ہے۔ وہ صرف ایک گناہ نہیں، وہ ایک جرم بھی ہے۔ بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے سب سے بڑا جرم۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی ذریعہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name ....

Address ....

....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:
☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque
Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Name ....

Address ....

....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76

October 1987 No 131

جلد دوم تیار

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں ۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے ۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے ۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے ۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے ۔ وہ طالبین قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے ۔



هدیه جلد اوّل ۸۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

Rs. 4